رات پشمینے کی

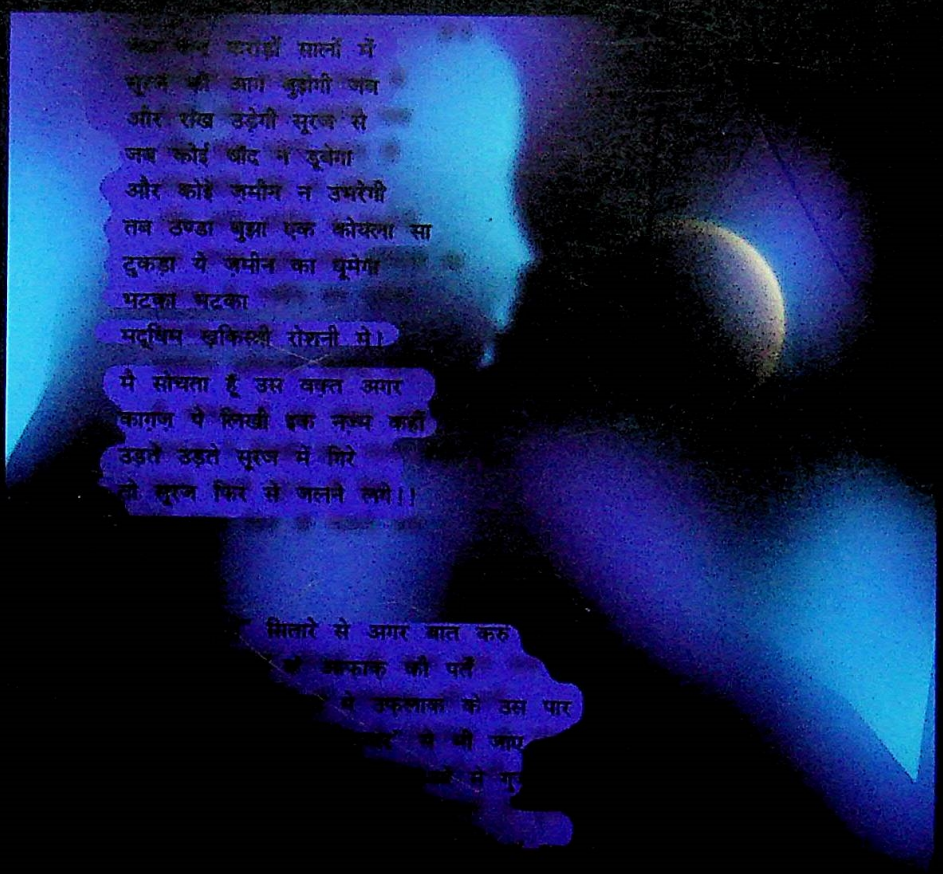

گلزار

گلزار سے

کہیں پہلے ملے ہیں ہم
دھنک کے سات رنگوں سے بنے پل پر ملے ہوں گے
جہاں پریاں تمہارے سُر کے کومل تیوروں پر رقص کرتی تھیں
پرندے اور نیلا آسمان
جھک جھک کے ان کو دیکھتے تھے
کبھی ایسا بھی ہوتا ہے ہمارے زندگی میں
کہ سب سُر ہار جاتے ہیں
فقط ایک چیخ بچتی ہے
تم ایسے میں بشارت بن کر آتے ہو
اور اپنی لے کے جادو سے
ہماری ٹوٹتی سانسوں سے ایک نغمہ بناتے ہو
کہ جیسے رات کی بنجر سیاہی سے سحر پھوٹے
تمہارے لفظ چھو کر تو ہمارے زخم لو دینے لگے ہیں

کہیں پہلے ملے ہیں ہم
افق سے تا افق پھیلے ہوئے
ایک گھر کے آنگن میں ملے ہوں گے
تمہارے ہاتھ کی پوروں نے
اس آنگن کا ہر گوشہ سجایا تھا
وہاں کے باسیوں کو درد کا ساجھی بنایا تھا
یہ آنگن نفرتوں کی دھوپ میں جلتی زمیں پر
چھاؤں جیسا تھا
جہاں خوشبو کنارے توڑ کر باہر نکلتی اور
ہوا سے جھومتے پیڑوں کے کاندھوں پر
زمانہ در زمانہ پھیل جاتی تھیں

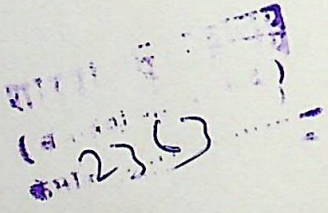

رات پشمینے کی

[illegible] पुस्तकालय
([illegible])
क्रमांक 2363

رات پشمینے کی

(شاعری)

گلزار

روپا اینڈ کو

© گلزار :۲۰۰۲ء

پہلا ایڈیشن :۲۰۰۲ء

ناشر :روپا اینڈ کمپنی

۱۶/۷ انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۲

سیلز سینٹرس :الہ آباد، بنگلور، چندی گڑھ، چنئی، دہرہ دون،

حیدر آباد، جے پور، کاٹھ مانڈو، کلکتہ، لدھیانہ، ممبئی، پونہ

کتابت و ڈیزائن :احد انٹر پرائزز

۲۶۰۹، بارہ دری شیر افگن، بلی ماران، دہلی۔۶

مطبع :ریکھا پرنٹرز پرائیویٹ لمیٹیڈ

اے۔۱۰۲/۱، اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیز۔۲،

نئی دہلی۔۱۱۰ ۰۲۰

ذکر جہلم کا ہے، بات ہے دینے کی
چاند پکھراج کا، رات پشمینے کی

بابا — آپ کے لیے!

جس طرح تن جُھلتی گرمی میں
ٹھنڈے دریا میں ڈُبکیاں لے کر
دل کو راحت نصیب ہوتی ہے
ایسا ہی اطمینان ہوتا ہے
تیری اچھی سی نظم کو پڑھ کر!
لگتا ہے زندگی کے دریا میں
ایک تاری لگا کے نکلے ہیں!
روح کیسی نہال ہوتی ہے!

☆ جناب احمد ندیم قاسمی

منو — تمہارے لئے!

آج تری اک نظم پڑھی تھی
پڑھتے پڑھتے لفظوں کے کچھ رنگ لبوں پر چھوٹ گئے
آہنگ زباں پر گھلتی رہی
اک لطف کا ریلا، سوچ میں کتنی دیر تلک لہراتا رہا
دیر تلک آنکھیں رس سے لبریز رہیں
سارا دن پیشانی پر
افشاں کے ذرّے جھلمل جھلمل کرتے رہے!

☆ منصورہ احمد

فہرست

پیش لفظ	احمد ندیم قاسمی		17
میرا خیال ہے کہ	گلزار		24

کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کے لیے

1	بوسکی ——— 1	30
2	بوسکی ——— 2	31
3	کائنات ——— 1	32
4	کائنات ——— 2	33
5	کائنات ——— 3	34
6	کائنات ——— 4	35
7	خدا ——— 1	36
8	خدا ——— 2	37
9	خدا ——— 3	38
10	خدا ——— 4	40
11	وقت ——— 1	42

12	وقت ـــــ 2	43
13	وقت ـــــ 3	44
14	فسادات ـــ 1	46
15	فسادات ـــ 2	47
16	فسادات ـــ 3	48
17	فسادات ـــ 4	49
18	فسادات ـــ 5	50
19	فسادات ـــ 6	51
20	آنسو ـــــ 1	52
21	آنسو ـــــ 2	54
22	آنسو ـــــ 3	55
23	بڈھا دریا ـ 1	56
24	بڈھا دریا ـ 2	57
25	بڈھا دریا ـ 3	58
26	پینٹنگ ـــ 1	59
27	پینٹنگ ـــ 2	60
28	پینٹنگ ـــ 3	61
29	بادل ـــــ 1	62
30	بادل ـــــ 2	63
31	پڑوسی ـــــ 1	64
32	پڑوسی ـــــ 2	65

چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

34	کتابیں	69
35	آئینہ	72
36	الجھن	74
37	غالب	75
38	پنچم	76
39	وِمبلڈن	78
40	وین گوگ کا ایک خط	80
41	غبارے	84
42	دیر آید	85
43	اینا کیری نینا	86
44	خبر ہے	89
45	بوچھاڑ	90
46	اک نظم	91
47	اگر ایسا بھی ہو سکتا	92
48	ہلسا	95
49	نصیر الدین شاہ کے لیے	96
50	کُہسار	98
51	رات	99
52	واردات	100

53	خوش آمدید	103
54	سدھارتھ کی واپسی	104
55	راکھ	108
56	خودکشی	109
57	وادی کشمیر	110
58	رات تعمیر کریں	111
59	زمین پر پڑاؤ	112
60	سکیچ	115
61	ایک منظر	116
62	تھرڈ ورلڈ	118
63	کلو وادی	120
64	خالی سمندر	122
65	سبز لمحے	124
66	مرثیہ	127
67	امجد خان	128
68	شاعر	130
69	ماضی ——— مستقبل	132
70	ہوا محل جے پور	133
71	گفتگو	134
72	جنگل	137
73	ٹوبہ ٹیک سنگھ	138
74	دونوں	140

75	وہی گلی تھی	142
76	دینہ میں	143
77	یدھ	144
78	ویڈیو	146
79	پت جھڑ	147
80	اور سمندر مر گیا	148
81	پربت	149
82	یہ سات رنگی دھنک	150
83	دن	151
84	دوست	152
85	بیمار یاد	153
86	اک قبر	154
87	زنداں نامہ	155
88	چاند کے نام ''سمن''	156
89	زیرو کس	157
90	ایک اور دن	158
91	میرے ہاتھ	159
92	مون سون	160
93	فٹ پاتھ	161
94	تعاقب	164
95	چاند گھر	165
96	سوناں	166

97	پوسٹ باکس	167
98	بڑھیارے	168
99	سوئمنگ پُول	169
100	ہنی مون	170
101	اُس رات	171
102	چھٹیاں گرمیوں کی	172
103	بابا بگلوس	174
104	املتاس	176
105	پہاڑ کی آگ	177
106	اک عمارت	178
107	وہ لاش	180
108	بارش	182
109	فتح پور سیکری	183
110	کچہریاں	184
111	قبرستان	186
112	حویلی	188
113	لباس	189
114	درد	190
115	شہد کا چھتا	191
116	ریپ	192
117	ریڈ	193

صہبائے غزل

پھولوں کی طرح لب کھول کبھی	197
حواس کا جہان ساتھ لے گیا	198
گلوں کو سننا ذرا تم صدائیں بھیجی ہیں	200
آنکھوں میں جل رہا ہے پہ بجھتا نہیں دھواں	202
کانچ کے پیچھے چاند بھی تھا اور کانچ کے اوپر کائی بھی	204
کچھ روز سے وہ سنجیدہ ہے	206
کہیں تو گرد اُڑے یا کہیں غبار دِکھے	207
کیوں غریبوں سے کھیلتی ہے رات	208
تنکا تنکا کانٹے توڑے ساری رات کٹائی کی	210
گرم لاشیں گریں فصیلوں سے	211
ایک پرواز دکھائی دی ہے	212
ترویٰنی ——— گنگا، جمنا، سرسوتی	
(217 سے 256 تک)	

اکیسویں صدی کا شاعر.....گلزار

دورِ حاضر میں، اردو زبان کی حد تک، گلزار سے زیادہ سراسر اور یجنل شاعر میری نظر سے نہیں گزرا۔ اس شاعر کی لفظیات، اس کی تشبیہات، اس کے استعارے، اس کے موضوعات، سب اردو کے ماضی اور حال کی شاعری سے اس قدر مختلف ہیں کہ روایت کے تسلسل کی حقیقت پر بھی شک گزرنے لگتا ہے جب کہ یہ حقیقت اٹل ہے کہ شاعر روایت سے بغاوت کا ہزار دعویٰ کرے، وہ اپنے وجود کو منوا کے چھوڑتی ہے، مگر ادھر گلزار ہے کہ اس کی غزل تک میں روایت کا کھوج نہیں لگایا جا سکتا، چہ جائیکہ اس کی نظم، جس کے انداز و اسلوب کی کوئی مثال، میرے مطالعے اور یادداشت کی حد تک، اس صدی کی اردو شاعری میں دستیاب نہیں ہے۔

ماضی و حال کے دوسرے کس شاعر کے ہاں شاید ہی سورج چٹانوں سے اتر

کر غروب ہوتا ہو، وقت قدیم وزنی عمارتوں میں کچھ ایسا رکھا ہو جیسے کاغذ پہ بٹہ (پیپر ویٹ) رکھ دیں، محبوبہ کی کُرتی سے اُدھڑ کو نکلا ہوا تاگا اس کی سانسوں کی زد میں کپکپایا جا رہا ہو، شاخ سے ٹوٹا ہوا زرد رنگ پتا ٹمٹایا ہو، خاموشی کے سنگِ مرمر پر تاریکی کی چادر تان کر رات تعمیر کی جا رہی ہو، اور اُن نچے ہوئے کھساروں کو دیکھ کر رونا آتا ہو جن کے سروں پر سے انسان نے اپنی تبر سے جنگل چھیلے ہوں، ان کے دریاؤں اور آبشاروں کو ننگا کر دیا ہو اور وہ پتھرائی آنکھوں سے فلک کو دیکھ رہے ہوں.....اور اب صرف چند مثالیں گلزار کے انتہائی حساس مشاہدے کی، جنہوں نے اس کی نظموں کی رگوں میں زندگی دوڑا رکھی ہے:

اک بھیگا ہوا، چھلکا چھلکا وہ لفظ بھی ہے
جب درد چھوئے تو آنکھوں میں آ جاتا ہے
کہنے کے لئے لب ہلتے ہیں
آنکھوں سے ادا ہو جاتا ہے

سلاخوں کے پیچھے بڑے انقلابی کی آنکھوں میں بھی
راکھ اترنے لگی ہے
دہکتا ہوا کوئلہ دیر تک جب نہ پھونکا گیا ہو
تو شعلے کی آنکھوں میں بھی
موتیے کی سفیدی اتر آتی ہے

شعراء نے انسان کی زندگی کی پیچیدگیوں، اس کی نفسیات کی گہرائیوں اور

اس کے خیالات کی رفعتوں کو یقیناً اپنا موضوع بنایا ہے مگر گلزار کے ہاں ان پیچیدگیوں، گہرائیوں اور رفعتوں کو شاعری میں جس طرح برتا گیا ہے وہ صرف اور صرف اس کا حصہ ہے۔ مسرت بخش حیرت ہوتی ہے کہ جہلم (پنجاب) کی سرزمین سے اٹھنے اور دہلی و ممبئی کے ماحول میں رہنے بسنے کے باوجود وہ اس حد تک اوریجنل کیسے ہو گیا ہے کہ اظہار کی یہ اور تخلیلٹی اس کی پہچان بن گئی ہو۔ آخر اس کے سوا اور کون ہے جس نے آکاش پر چاند کو پیپل کے ایک سوکھے پتے کی صورت میں دیکھا ہو اور سوچا ہو کہ کہیں وہ لہراتا ہوا اس کے گھر کے لان میں نہ اتر آئے! اور پھر سمندر میں کود کو خودکشی کرنے والی، حسن کی اس دیوی کا ذکر کیا ہو جس کے پاؤں کی گلابی ایڑیوں کے نیچے سمندر اپنے جھاگ کا نمدہ بچھاتا تھا۔

اب کان دھر کر سینے کہ گلزار کی بعض نظموں میں سے یہ بلیغ اقتباس کیا کہہ رہے ہیں:

تمہاری فرقت میں جو گزرتا ہے اور پھر بھی نہیں گزرتا
میں وقت کیسے بیاں کروں، وقت اور کیا ہے؟
کہ وقت بانگِ جرس نہیں جو بتا رہا ہو کہ دو بجے ہیں

ترے خط آتے رہتے ہیں تو مجھ کو یاد رہتے ہیں
تری آواز کے سُر بھی
تری آواز کو کاغذ پہ رکھ کر، میں نے چاہا تھا
کہ ''پن'' کر لوں

وہ جیسے تتلیوں کے پر لگا لیتا ہے کوئی
اپنی البم میں

میں گلزار کی شاعری پر مختصراً کچھ کہنے بیٹھا ہوں تو میری مشکل یہ ہے کہ گلزار کی ہر نظم مجھے جکڑ کر بٹھا دیتی ہے اور میں حیرت زدہ ہو کر سوچتا ہوں کہ آگے کیسے بڑھوں جب کہ اس نظم کا ایک ایک ٹکڑا میرے دامن دل کو کھینچتا ہو کہ ذرا رکو اور مجھ سے پوری طرح لطف اندوز تو ہو لو۔

نظموں کے اس حیرت کدے سے نکل کر میں نے سوچا کہ گلزار کی ''ترویناں'' پڑھنی چاہئیں کہ وہ بہت مختصر ہوتی ہیں اور ان میں گلزار کے مشاہدات و احساسات کے بیان کی گنجائش کم سے کم ہوگی۔ مگر گلزار یہاں بھی چین نہیں لینے دیتا۔ گلزار کے اپنے بیان کے مطابق تین مصرعوں کی ان نظموں کو اس نے ''ترویٰنی'' کا نام اس لیے دیا ہے کہ پہلے دو مصرعے گنگا جمنا کی طرح ملتے ہیں اور ایک خیال، ایک تصور، ایک جذبے، ایک شعر کو مکمل کرتے ہیں لیکن ان دو دھاراؤں کے نیچے ایک اور ندی ہے۔ سرسوتی کی ندی، جو بظاہر پوشیدہ ہے اور نظر نہیں آتی مگر ترویٰنی کا تیسرے مصرعے کا کام یہ سرسوتی دکھاتی ہے۔ اس ''تیسرے مصرعے'' کے طلسم کی دو مثالیں!

تیری صورت جو بھری رہتی ہے آنکھوں میں سدا
اجنبی لوگ بھی پہچانے سے لگتے ہیں مجھے

تیرے رشتے میں تو دنیا ہی پرولی میں نے

کبھی کبھی بازار میں یوں بھی ہو جاتا ہے
قیمت ٹھیک تھی، جیب میں اتنے دام نہیں تھے

ایسے ہی اک بار میں تم کو ہار آیا تھا!

تین تین مصرعوں کی مختصر نظموں کا سلسلہ بطور خاص آج کل عام ہو رہا ہے۔ بہت سے اردو شعراء نے جاپانی صنف سخن ''ھائیکو'' کو آزمایا ہے اور اردو ھائیکو کی کتابیں تک شائع ہو گئی ہیں، مگر الا ماشا اللہ اس جاپانی صنف کے بنیادی مطالبات کم ہی پیش نظر رکھے گئے ہیں۔ اس طرح اردو کے ایک معروف شاعر نے تین مصرعوں کی نظمیں کہنا شروع کیں اور انہیں ''ثلاثی'' کا نام دیا جب کہ ثلاثی برسوں پہلے سے موجود تھی اور بعض شعراء نے ماضی میں بھی ثلاثیاں لکھی ہیں۔ آج کل پنجابی لوک گیت ''ماھیا'' کو آزمایا جا رہا ہے اور یہ کم سوچا جا رہا ہے کہ ماھیا کے لیے ایک خاص قسم کا دیہی پس منظر، دیہی معاشرہ، دیہی کلچر درکار ہے اور اگر یہ نہیں ہوگا تو ''ماھیا'' کی ہیئت تو شاید برقرار رہے مگر ماھیا کا موضوع و مفہوم شکست خوردہ ہو جائے گا۔ معروف شاعر ماجد صدیقی نے پنجابی لوک شاعری کی ایک اور دلآویز صنف ''بولیاں'' میں کامیاب طبع آزمائی کی ہے۔ یہ بولی تین کی بجائے صرف دو مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے، مثلاً پنجابی کی ایک بولی:

گوری لاہ کے پزیاں رکھیاں
دھرتی نوں پھل لگ گئے

(لڑکی نے پازیبیں اتار کر رکھیں تو جیسے دھرتی پر پھول سج گئے)

مگر گلزار کی ترویٰنی ان سب سے سراسر مختلف ہے۔

زمین اس کی، زمیں کی یہ نعمتیں اس کی
یہ سب اسی کا ہے، گھر بھی، یہ گھر کے بندے بھی

خدا سے کہئے، کبھی وہ بھی اپنے گھر آئے

تمام صفحے کتابوں کے پھڑپھڑانے لگے
ہوا دکھیل کے دروازہ، آ گئی گھر میں

کبھی ہوا کی طرح تم بھی آیا جایا کرو!

کوئی صورت بھی مجھے پوری نظر آتی نہیں
آنکھ کے شیشے مرے، چٹخے ہوئے ہیں کب سے

ٹکڑوں ٹکڑوں میں سبھی لوگ ملے ہیں مجھ کو

بعض شعراء نے گلزار کے تتبع میں اب ترویٰنیاں لکھنا بھی شروع کر دیا ہے۔
یہ صنف اردو کے چومصرعے "قطعہ" کی طرح یقیناً کامیاب رہے گی کہ اس کی رہنمائی

گلزار کے سے استاد کے ہاتھ میں ہے۔

مجھے ''رات پشمینے کی'' کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا ہے کہ تفصیل میں جانے سے شاعری کے ذہین اور حساس قاری کا حق چھیننے کا ارتکاب کر بیٹھوں گا۔ آخر میں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ گلزار جو اپنے فلمی گیتوں سے قطع نظر اردو شاعری کی طرف بیسویں صدی کے اواخر میں متوجہ ہوا تھا' اکیسویں صدی کا شاعر ہے کہ اس کے جذبہ و احساس اور وجدان میں یہ نئی صدی غنچے کی طرح چٹختی اور کھلتی نظر آ رہی ہے۔

احمد ندیم قاسمی

میرا خیال ہے...

میرا خیال ہے، نیا مجموعہ لوگوں کے سامنے پیش کرنے سے پہلے، ہر شاعر کو ایک بار تو یہ گھبراہٹ ضرور ہوتی ہو گی، پتہ نہیں، اب لوگ کیا کہیں گے۔ اِکا دُکا نظمیں لکھتے رہنے، اور چھپ جانے سے اپنے پورے کام کا اندازہ نہیں ہو پاتا۔ جب دھان کی ڈھیری لگتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ پچھلے سال میں کتنا مینہ برسا، کتنی دھوپ کھلی!

بہت سے موضوع پچھلے مجموعے سے الگ ہیں۔ کہیں نظموں کو پکنے میں دیر لگی، کہیں میں دیر سے پکا۔ کہنے کا حوصلہ کم تھا۔ ہر بار بابا نے تھپکی دی اور حوصلہ افزائی کی۔ منو نے ہاتھ پکڑا اور آگے بڑھا دیا۔ یہ مجموعہ بھی اُس کی بدولت تیار ہوا ہے۔

مجموعے میں ایک بار پھر 'ترویئی' شامل ہے۔ 'ترویئی' نہ تو مثلث ہے، نہ ہائیکو، نہ تین مصرعوں میں کہی ایک نظم اِن تینوں 'فارمز' میں ایک خیال، اور

ایک امیج کا تسلسل ملتا ہے۔ لیکن 'ترویٰنی' کا فرق اس کے مزاج کا فرق ہے۔ تیسرا مصرعہ پہلے دو مصرعوں کے مفہوم کو کبھی نکھار دیتا ہے، کبھی اضافہ کرتا ہے، یا ان پر 'کمینٹ' کرتا ہے۔ 'ترویٰنی' نام اس لیے دیا تھا کہ سنگم پر تین ندیاں ملتی ہیں۔ گنگا، جمنا اور سرسوتی۔ گنگا اور جمنا کے دھارے سطح پر نظر آتے ہیں، لیکن سرسوتی جو ٹیکسلا کے راستے سے بہہ کر آتی تھی، وہ زمین دوز ہو چکی ہے۔ 'ترویٰنی' کے تیسرے مصرعے کا کام سرسوتی دِکھانا ہے جو پہلے دو مصرعوں سے چھپی ہوئی ہے۔

اُمید بھی ہے، گھبراہٹ بھی کہ اب لوگ کیا کہیں گے، اور اس سے بڑا ڈر یہ ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ کچھ بھی نہ کہیں!!

گلزار

۲۵ر فروری ۲۰۰۲ء

ممبئی (انڈیا)

آتش کدہ ہے سینہ مرا رازِ نہاں سے
اے وائے اگر معرضِ اظہار میں آوے

—— غالبؔ

کچھ اور چاہیے وسعت میرے بیاں کے لیے

بوسکی۔۱

بوسکی بیاہنے کا اب وقت قریب آنے لگا ہے
جسم سے چھُوٹ رہا ہے کچھ کچھ
روح میں ڈوب رہا ہے کچھ کچھ
کچھ اداسی ہے، سکوں بھی
صبح کا وقت ہے پَو پھٹنے کا، یا جھٹپٹا شام کا ہے
معلوم نہیں۔
یوں بھی لگتا ہے کہ جو موڑ بھی اب آئے گا
وہ کسی اور طرف مڑ کے چلی جائے گی،
اُگتے ہوئے سورج کی طرف
اور میں سیدھا ہی کچھ دور اکیلا جا کر
شام کے دوسرے سورج میں سما جاؤں گا!

ناراض ہے مجھ سے بوسکی شاید
جسم کا اک انگ چپ چپ سا ہے
سُوجے سے لگتے ہیں پاؤں
سوچ میں ایک بھنور کی آنکھ ہے
گھوم گھوم کر دیکھ رہی ہے

بوسکی، سورج کا ٹکڑا ہے
میرے خون میں رات اور دن گھُلتا رہتا ہے
وہ کیا جانے، جب وہ روٹھے
میری رگوں میں خون کی گردش مدھّم پڑنے لگتی ہے!

بوسکی ۔۲

بس چند کروڑوں سالوں میں
سورج کی آگ بجھے گی جب
اور راکھ اُڑے گی سورج سے
جب کوئی چاند نہ ڈوبے گا
اور کوئی زمین نہ ابھرے گی
تب ٹھنڈا بجھا اک کوئلہ سا
ٹکڑا یہ زمیں کا گھومے گا
بھٹکا بھٹکا
مدّھم خاکستری روشنی میں!

میں سوچتا ہوں اُس وقت اگر
کاغذ پہ لکھی اک نظم کہیں اُڑتے اُڑتے
سورج میں گرے
تو سورج پھر سے جلنے لگے!!

کائنات۔۱

اپنے "سنتوری" ستارے سے اگر بات کروں
تہ بہ تہ چھیل کے آفاق کی پرتیں
کیسے پہنچے گی مری بات یہ افلاک کے اس پار بھلا؟
کم سے کم "نور کی رفتار" سے بھی جائے اگر
ایک سو صدیاں تو خاموش خلاؤں سے گذرنے میں لگیں گی
کوئی مادہ ہے مری بات میں تو
"نون" کے نقطے سی رہ جائے گی بلیک ہول گذر کے
کیا وہ سمجھے گا؟
میں سمجھاؤں گا کیا؟

کائنات۔۲

CENTUAR-1

کائنات ۔۔۔۔ ۴

بہت بونا ہے یہ سورج ۔۔۔۔۔!
ہماری کہکشاں کی اس نواحی سی گیلیکسی[1] میں
بہت بونا سا یہ سورج جو روشن ہے ۔۔۔۔۔
یہ میری کُل حدوں تک روشنی پہنچا نہیں پاتا
میں مارز[2] اور جیوپٹر[3] سے جب گزرتا ہوں
بھنور سے بلیک ہولوں[4] کے
مجھے ملتے ہیں رستے میں
سیہ گرداب چکراتے ہی رہتے ہیں
مسل کے جستجو کے ننگے صحراؤں میں واپس پھینک دیتے ہیں
زمیں سے اس طرح باندھا گیا ہوں مَیں
گلے سے ''گریویٹی''[5] کا دائمی پٹہ نہیں کھلتا!

1- Galaxy. 2- Mars. 3-Jupitor. 4-Black Holes. 5-Gravity

رات میں جب بھی مری آنکھ کھلے
ننگے پاؤں ہی نکل جاتا ہوں
آسمانوں سے گزر جاتا ہوں
کہکشاں چھو کے نکلتی ہے جو اک پگڈنڈی
اپنے پچھواڑے کے "سنتوری" ستارے کی طرف
دودھیا تاروں پہ پاؤں رکھتا
چلتا رہتا ہوں یہی سوچ کے میں
کوئی سیارہ اگر جاگتا مل جائے کہیں
اک پڑوسی کی طرح پاس بلا لے شاید
اور کہے
آج کی رات یہیں رہ جاؤ
تم زمیں پر ہو اکیلے
میں یہاں تنہا ہوں!

کائنات۔۴

برا لگا تو ہو گا اے خدا تجھے

دعا میں جب

جمائی لے رہا تھا مَیں!

دعا کے اِس عمل سے تھک گیا ہوں میں

مَیں جب سے دیکھ سن رہا ہوں

تب سے یاد ہے مجھے

خدا جلا بجھا رہا ہے رات دن

خدا کے ہاتھ میں ہے سب بُرا بھلا

دعا کرو

عجیب سا عمل ہے یہ

یہ ایک فرضی گفتگو

اور ایک طرفہ ---- ایک ایسے شخص سے

خیال جس کی شکل ہے

خیال ہی ثبوت ہے!

خدا۔۱

میں دیوار کی اِس جانب ہوں!
اِس جانب تو دھوپ بھی ہے، ہریالی بھی!
اوس بھی گرتی ہے پتّوں پر
آجائے تو، آلسی کہرہ
شاخ پہ بیٹھا، گھنٹوں اونگھتا رہتا ہے
بارش لمبی لمبی تاروں پر ننھی کی طرح تھرکتی آنکھ سے گم ہو جاتی ہے
جو موسم آتا ہے، سارے رَس دیتا ہے

لیکن اِس کچی دیوار کی دوسری جانب
کیوں ایسا سنّاٹا ہے
کون ہے جو آواز نہیں کرتا لیکن
دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا رہتا ہے!

خدا_۲

پچھلی بار ملا تھا جب میں
ایک بھیانک جنگ میں کچھ مصروف تھے تم
نئے نئے ہتھیاروں کی رونق سے کافی خوش لگتے تھے
اس سے پہلے انتولہ میں
بھوک سے مرتے بچوں کی لاشیں دفناتے دیکھا تھا
اور اک بار---- ایک اور ملک میں زلزلہ دیکھا
کچھ شہروں کے شہر گرا کے دوسری جانب لوٹ رہے تھے

تم کو فلک سے آتے بھی دیکھا تھا میں نے
آس پاس کے سیاروں پر دھول اڑاتے
کود پھلانگ کے دوسری دنیاؤں کی گردش
توڑ تاڑ کے "گیلکسیز" کے محور تم
جب بھی زمیں پر آتے ہو
بھونچال چلاتے اور سمندر کھولاتے ہو
بڑے اِیریٹک سے لگتے ہو
کائنات میں کیسے لوگوں کی صحبت میں رہتے ہو تم

خدا -۳

---

erratic

پورے کا پورا آکاش گھما کر بازی دیکھی میں نے!

کالے گھر میں سورج رکھ کے
تم نے شاید سوچا تھا میرے سب مُہرے پٹ جائیں گے
میں نے ایک چراغ جلا کر
اپنا رستہ کھول لیا

تم نے ایک سمندر ہاتھ میں لے کر مجھ پر ڈھیل دیا
میں نے نوح کی کشتی اس کے اوپر رکھ دی

کال چلا تم نے، اور میری جانب دیکھا
میں نے کال کو توڑ کے لمحہ لمحہ جینا سیکھ لیا

میری خودی کو تم نے چند چمتکاروں سے مارنا چاہا
میرے اک پیادے نے تیرا چاند کا مُہرہ مار لیا

موت کی شہہ دے کر تم نے سمجھا تھا اب تو مات ہوئی
میں نے جسم کا خول اتار کے سونپ دیا ——— اور روح بچالی!

پورے کا پورا آکاش گھما کر اب تم دیکھو بازی!!

خدا ——— ۴

میں اڑتے ہوئے پنچھیوں کو ڈراتا ہوا
کچلتا ہوا گھاس کی کلغیاں
گراتا ہوا گردنیں ان درختوں کی، چھپتا ہوا
جن کے پیچھے سے
نکلا چلا جا رہا تھا وہ سورج-----
تعاقب میں تھا اس کے میں!
گرفتار کرنے گیا تھا اسے
جو لے کے مری عمر کا ایک دن بھاگتا جا رہا تھا

وقت۔۱

وقت ۔۲

وقت کی آنکھ پہ پٹی باندھ کے، کھیل رہے
تھے آنکھ مچولی!

رات اور دن اور چاند اور میں!
دور گرا جا کر میں، جیسے،
روشنیوں کے دھکے سے
پرچھائیں زمیں پر گرتی ہے
دھیّا چھونے سے پہلے ہی،
وقت نے چور کہا اور آنکھیں کھول کے
مجھ کو پکڑ لیا!

تمہاری فرقت میں جو گزرتا ہے، اور پھر بھی نہیں گزرتا
میں وقت کیسے بیاں کروں، وقت اور کیا ہے؟
کہ وقت بانگِ جرس نہیں جو بتا رہا ہے کہ دو بجے ہیں
کلائی پر جس عقاب کو باندھ کر سمجھتا ہوں وقت ہے،
وہ وہاں نہیں ہے!
وہ اُڑ چکا
جیسے رنگ اڑتا ہے میرے چہرے کا، ہر تحیّر پہ، اور دِکھتا نہیں کسی کو
وہ اُڑ رہا ہے کہ جیسے اس بیکراں سمندر سے بھاپ اڑتی ہے
اور دِکھتی نہیں کہیں بھی

قدیم وزنی عمارتوں میں
کچھ ایسے رکھا ہے جیسے کاغذ پہ بٹار رکھ دیں

دبا دیں، تاریخ اڑ نہ جائے
میں وقت کیسے بیاں کروں، وقت اور کیا ہے؟

کبھی کبھی وقت یوں بھی لگتا ہے مجھ کو جیسے
غلام ہے
آفتاب کا اک دہکتا گولا اٹھا کے ہر روز پیٹھ پر وہ
فلک پہ چڑھتا ہے چپّہ چپّہ قدم جما کر
وہ پورا کہسار پار کر کے
اتارتا ہے، اُفق کی دہلیز پر دہکتا ہوا سا پتھر
ٹکا کے پانی کی پتلی سُتلی پہ، لوٹ جاتا ہے اگلے دن کا اٹھانے گولہ
اور اس کے جاتے ہی
دھیرے دھیرے وہ پورا گولہ نگل کے باہر نکلتی ہے
رات اپنی پیلی سی جیب کھولے
غلام ہے وقت گردشوں کا
کہ جیسے اس کا غلام میں ہوں!!

وقت ۔۳

اُفق پھلانگ کے اُمڈا ہجوم لوگوں کا
کوئی منارے سے اترا، کوئی منڈیروں سے
کسی نے سیڑھیاں لپکیں، ہٹائیں دیواریں
کوئی اذاں سے اٹھا ہے، کوئی جرس سن کر
غصیلی آنکھوں میں، پھنکارتے حوالے لئے
گلی کے موڑ پہ آکر ہوئے ہیں جمع سبھی
ہر اک کے ہاتھ میں پتّھر ہیں کچھ عقیدوں کے
خدا کی ذات کو سنگسار کرنا ٹھہرا ہے

فسادات۔۱

معجزہ کوئی بھی اُس شب نہ ہوا
جتنے بھی لوگ تھے اُس روز عبادت گہ میں
سب کے ہونٹوں پہ دعا تھی

اور آنکھوں میں چراغاں تھا یقیں کا
کہ خدا! کا گھر ہے
زلزلے توڑ نہیں سکتے اسے، آگ جلا سکتی نہیں
سینکڑوں معجزوں کی سب نے حکایات سنی تھیں

سینکڑوں ناموں سے ان سب نے پکارا اس کو
غیب سے کوئی بھی آواز نہیں آئی کسی کی
نہ خدا کی----- نہ پولس کی!!

سب کے سب بھونے گئے آگ میں، اور بھسم ہوئے
معجزہ کوئی بھی اس شب نہ ہوا!!!

فسادات ۔ ۲

معجزے ہوتے ہیں----- یہ بات سنا کرتے تھے!
وقت آنے پہ مگر
آگ سے پھول اُگے، اور نہ زمیں سے کوئی دریا پھوٹا
نہ سمندر سے کسی موج نے پھینکا آنچل
نہ فلک سے کوئی کشتی اتری

فسادات ۔ ۳

آزمائش کی تھی کل رات خداؤں کے لئے
کل مرے شہر میں گھر ان کے جلائے سب نے!!

اپنی مرضی سے تو مذہب بھی نہیں اس نے چُنا تھا
اس کا مذہب تھا جو ماں باپ سے ہی اس نے وراثت میں لیا تھا
اپنے ماں باپ چُننے کوئی، یہ ممکن ہی کہاں ہے
ملک میں مرضی تھی اس کی، نہ وطن اس کی رضا سے

وہ تو کُل نو ہی برس کا تھا اسے کیوں چن کر
فرقہ وارانہ فسادات نے کل قتل کیا۔۔۔۔؟

فسادات ۔ ۴

آگ کا پیٹ بڑا ہے
آگ کو چاہئے، ہر لحظہ چبانے کیلئے خشک کرارے پتے
آگ کر لیتی ہے تنکوں پہ گذارا لیکن
آشیانوں کو نگلتی ہے نوالوں کی طرح
آگ کو سبز ہری ٹہنیاں اچھی نہیں لگتیں
ڈھونڈتی ہے کہ کہیں سوکھے ہوئے جسم ملیں!

اس کو جنگل کی ہوا راس بہت ہے پھر بھی
اب غریبوں کی کئی بستیوں پر دیکھا ہے حملہ کرتے
آگ اب مندر و مسجد کی غذا کھاتی ہے
لوگوں کے ہاتھوں میں اب آگ نہیں
آگ کے ہاتھوں میں کچھ لوگ ہیں اب!!

فسادات ۔ ۵

شہر میں آدمی کوئی بھی نہیں قتل ہوا
نام تھے لوگوں کے، جو قتل ہوئے
سر نہیں کاٹا، کسی نے بھی، کہیں پر کوئی
لوگوں نے ٹوپیاں کاٹی تھیں، کہ جن میں سر تھے
اور یہ بہتا ہوا سرخ لہو ہے جو سڑک پر
ذبح ہوتی ہوئی آوازوں کی گردن سے گرا تھا

فسادات ۔ ۶

الفاظ جو اگتے، مرجھاتے، جلتے بجھتے رہتے ہیں میرے چاروں طرف
الفاظ جو میرے گرد پتنگوں کی صورت اڑتے رہتے ہیں رات اور دن
ان لفظوں کے کردار ہیں، ان کی شکلیں ہیں
رنگ روپ بھی ہیں---- اور عمریں بھی

کچھ لفظ بہت بیمار ہیں، اب چل سکتے نہیں
کچھ لفظ تو بستر مرگ پہ ہیں
کچھ لفظ ہیں جن کو چوٹیں لگتی رہتی ہیں
میں پٹیاں کرتا رہتا ہوں
الفاظ کئی ہر چار طرف بس یوں ہی تھوکتے رہتے ہیں
گالی کی طرح
مطلب بھی نہیں، مقصد بھی نہیں

کچھ لفظ ہیں منہ میں رکھے ہوئے
"چیونگ گم" کی طرح ہم جن کی جگالی کرتے ہیں
لفظوں کے دانت نہیں ہوتے، پر کاٹتے ہیں
اور کاٹ لیں تو پھر ان کے زخم نہیں بھرتے

ہر روز مدرسوں میں ٹیچر، آتے ہیں گالیں بھر بھر کر
چھ چھ گھنٹے الفاظ لٹاتے رہتے ہیں
برسوں کے گھسے، بے رنگ سے، بے آہنگ سے
پھیکے لفظ کہ جن میں رس بھی نہیں
معنی بھی نہیں !

اک بھیگا ہوا، چھلکا چھلکا، وہ لفظ بھی ہے
جب درد چھوے تو آنکھوں میں آجاتا ہے
کہنے کے لئے لب ہلتے نہیں
آنکھوں سے ادا ہو جاتا ہے!!

آنسو۔۱

سنا ہے مٹی پانی کا ازل سے ایک رشتہ ہے
جڑیں مٹی میں لگتی ہیں
جڑوں میں پانی رہتا ہے
تمہاری آنکھ سے آنسو کا گرنا تھا کہ دل میں درد بھر آیا
ذرا سے بیج سے کونپل نکل آئی
جڑیں مٹی میں لگتی ہیں
جڑوں میں پانی رہتا ہے

آنسو۔۲

آنسو ۔ ۳

شیشم اب تک سہما سا چپ چاپ کھڑا ہے
بھیگا بھیگا، ٹھٹھرا ٹھٹھرا
بوندیں پتہ پتہ کر کے
ٹپ ٹپ کرتی ٹوٹتی ہیں تو سسکی کی آواز آتی ہے
بارش کے جانے کے بعد بھی
دیر تلک ٹپکا رہتا ہے
تم کو چھوڑے دیر ہوئی ہے
آنسو اب تک ٹوٹ رہے ہیں

منہ ہی منہ کچھ بُڑبُڑ کرتا بہتا ہے یہ بُڈّھا دریا
کوئی پوچھے، تجھ کو کیا لینا، کیا لوگ کناروں پر کرتے ہیں؟
تو مت سن، مت کان لگا ان کی باتوں پر
گھاٹ پہ لچھی کو گر جھوٹ کہا ہے سالے مادھو نے
تجھ کو کیا لینا لچھی سے، جائے جا کے ڈوب مرے!

یہی تو دکھ ہے دریا کو
جنمی تھی تو "آنول نال" اُسی کے ہاتھ میں سونپی تھی،
جھولن دائی نے--
اس نے ہی ساگر پہنچائے تھے وہ "بیڑے"
کل جب پیٹ نظر آئے گا، ڈوب مرے گی
اور وہ لاش بھی اس کو ہی گم کرنی ہو گی!
لاش ملی تو گاؤں والے لچھی کو بدنام کریں گے!
منہ ہی منہ کچھ بُڑبُڑ کرتا بہتا رہتا ہے یہ دریا!

بُڈّھا دریا ۔۱

منہ ہی منہ کچھ بُڑبُڑ کرتا، بہتا ہے یہ بڈھا دریا
دن دوپہرے میں نے اس کو خراٹے لیتے دیکھا ہے
ایسا چِت بہتا ہے دونوں پاؤں پسارے
پتّھر پھینکیں، ٹانگ سے کھینچیں، بگلے آکر چونچیں ماریں
ٹس سے مس ہوتا ہی نہیں ہے-----!

چونک اٹھتا ہے جب بارش کی بوندیں آکر چبھتی ہیں
دھیرے دھیرے ہانپنے لگ جاتا ہے اس کے پیٹ کا پانی
تِل مِل کرتا ریت پہ دونوں باہیں مارنے لگتا ہے

بُڈّھا دریا ۔۲

بارش پتلی پتلی بوندوں سے جب اس کے پیٹ میں، گُدگُدی کرتی ہے

بڈّھا دریا۔۳

منہ ہی منہ کچھ بُڑ بُڑ کرتا، بہتا ہے یہ بڈّھا دریا
پیٹ کا پانی دھیرے دھیرے سوکھ رہا ہے
دُبلا دُبلا رہتا ہے اب
کود کے گرتا تھا یہ جس پتھر سے پہلے
وہ پتھر اب دھیرے سے لٹکا کے اس کو
اگلے پتھر سے کہتا ہے
اس بڈّھے کو ہاتھ پکڑ کے پار کرا دے

کھڑکھڑاتا ہوا نکلا ہے اُفق سے سورج
جیسے کیچڑ میں پھنسا پہیہ دھکیلا ہو کسی نے
چِپّے ٹبّے سے کناروں پہ نظر آتے ہیں
روز سا گول نہیں
اُدھڑے اُدھڑے سے اجالے ہیں بدن پر
اور چہرے پر کھرونچوں کے نشان ہیں

پینٹنگ ۔۱

رات جب گہری نیند میں تھی کل
ایک تازہ سفید کینوس پر
آتشیں لال سرخ رنگوں سے
میں نے روشن کیا تھا اک سورج
صبح تک جل چکا تھا وہ کینوس
راکھ بکھری ہوئی تھی کمرے میں!!

پینٹنگ۔۲

"جورہٹ" میں، ایک دفعہ
دور اُفق کے ہلکے ہلکے کُہرے میں
"ہیمن بروا" کے چائے باگان کے پیچھے
چاند کچھ ایسے دِکھتا تھا
جیسے چینی مٹّی کی چمکیلی کیتل رکھی ہو!

پینٹنگ ۔ ۳

آسام میں باغ کو "باگان" کہتے ہیں۔

بادل۔۱

رات کو پھر بادل نے آ کر
گیلے گیلے پنجوں سے جب دروازے پر دستک دی
جھٹ سے اُٹھ کے بیٹھ گیا مَیں بستر میں
اکثر نیچے آ کر یہ کچی بستی میں
لوگوں پر غراتا ہے_____
لوگ بچارے ''ڈامبر☆'' لیپ کے دیواروں پر
بند کر لیتے ہیں جھریاں
تا کہ جھانک نہ پائے گھر کے اندر
لیکن پھر بھی_____
غراتا چنگھاڑتا بادل
اکثر ایسے لُوٹ کے لے جاتا ہے بستی
جیسے ٹھاکر کا کوئی غنڈہ
بدمستی کرتا نکلے اس بستی سے!!

☆ ڈامبر = بمبئی کی زبان میں تارکول۔

کل صبح جب بارش نے آ کر کھڑکی پر دستک دی تھی
نیند میں تھا مَیں باہر ابھی اندھیرا تھا
یہ تو کوئی وقت نہیں تھا' اٹھ کر اس سے ملنے کا
میں نے پردہ کھینچ دیا
گیلا گیلا ایک ہوا کا جھونکا اس نے
پھونکا میرے منہ پر لیکن
میری ''سنس آف ہیومر'' بھی کچھ نیند میں تھی
میں نے اٹھ کر زور سے کھڑکی کے پَٹ اُس پر بھیڑ دیے
اور کروٹ لے کر' پھر بستر میں ڈوب گیا

شاید بُرا لگا تھا اس کو
غصّے میں کھڑکی کے کانچ پہ ہتھڑ مار کے لوٹ گئی وہ
دوبارہ پھر آئی نہیں
کھڑکی پر وہ چٹخا کانچ ابھی باقی ہے!!

بادل ۔۲

کچھ دن سے پڑوسی کے
گھر میں سناٹا ہے
نہ ریڈیو چلتا ہے
نہ رات کو آنگن میں
اڑتے ہوئے برتن ہیں

اس گھر کا پلا کتا
کھانے کے لئے دن بھر
آجاتا ہے میرے گھر
پھر رات اسی گھر کی
دہلیز پہ سر رکھ کر
سو جایا کرتا ہے

پڑوسی ۔۱

آنگن کے احاطے میں
رسّی پہ ٹنگے کپڑے
افسانہ سناتے ہیں
احوال بتاتے ہیں
کچھ روز رُٹھائی کے
ماں باپ کے گھر رہ کر
پھر میرے پڑوسی کی
بیوی لوٹ آئی ہے

دو چار دنوں میں پھر
پہلے سی فضا ہو گی
آکاش بھرا ہو گا
اور رات کو آنگن سے
کچھ کومٹ گذریں گے
کچھ طشتریاں اتریں گی!

پڑوسی ۔۲

چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

کتابیں جھانکتی ہیں بند الماری کے شیشوں سے
بڑی حسرت سے تکتی ہیں
مہینوں اب ملاقاتیں نہیں ہوتیں
جو شامیں ان کی صحبت میں کٹا کرتی تھیں، اب اکثر
گذر جاتی ہیں 'کمپیوٹر' کے پردوں پر
بڑی بے چین رہتی ہیں کتابیں ــــــــ
انہیں اب نیند میں چلنے کی عادت ہوگئی ہے
بڑی حسرت سے تکتی ہیں،

جو قدریں وہ سناتی تھیں _____
کہ جن کے سیل☆ کبھی مرتے نہیں تھے
وہ قدریں اب نظر آتی نہیں گھر میں
جو رشتے وہ سناتی تھیں

وہ سارے اُدھڑے اُدھڑے ہیں
کوئی صفحہ پلٹتا ہوں تو اک سسکی نکلتی ہے
کئی لفظوں کے معنی گر پڑے ہیں
بنا پتوں کے سوکھے ٹنڈ لگتے ہیں وہ سب الفاظ
جن پر اب کوئی معنی نہیں اُگتے

بہت سی اصطلاحیں ہیں _____
جو مٹی کے سکوروں کی طرح بکھری پڑی ہیں
گلاسوں نے انہیں متروک کر ڈالا!
زباں پر ذائقہ آتا تھا جو صفحے پلٹنے کا
اب اُنگلی کلِک☆ کرنے سے بس اک
جھپکی گذرتی ہے _____

بہت کچھ تہہ بہ تہہ کھلتا چلا جاتا ہے پردے پر
کتابوں سے جو ذاتی رابطہ تھا، کٹ گیا ہے
کبھی سینے پہ رکھ کے لیٹ جاتے تھے

☆ CELL
☆ CLICK

کبھی گودی میں لیتے تھے،
کبھی گھٹنوں کو اپنے رِحل کی صورت بنا کر
نیم سجدے میں پڑھا کرتے تھے، چھُوتے تھے جبیں سے
وہ سارا علم تو ملتا رہے گا بعد میں بھی
مگر وہ جو کتابوں میں ملا کرتے تھے سُوکھے پھول اور
اور مہکے ہوئے رُقعے
کتابیں مانگنے، گرنے، اُٹھانے کے بہانے رشتے بنتے تھے
اُن کا کیا ہوگا؟
وہ شاید اب نہیں ہوں گے!

کتابیں

یہ آئینہ بولنے لگا ہے

میں جب گذرتا ہوں سیڑھیوں سے

یہ باتیں کرتا ہے----- آتے جاتے میں پوچھتا ہے

"کہاں گئی وہ پھُتوئی تیری

یہ کوٹ نکٹائی تجھ پہ پھبتی نہیں، یہ مصنوعی لگ رہی ہے!"

یہ میری صورت پہ نکتہ چینی تو ایسے کرتا ہے جیسے میں اس کا

عکس ہوں اور وہ جائزہ لے رہا ہے میرا

"تمہارا ماتھا کشادہ ہونے لگا ہے لیکن

تمہارے ابرُو سکڑ رہے ہیں

تمہاری آنکھوں کا فاصلہ کمتا جا رہا ہے

تمہارے ماتھے کی بیچ والی شکن بہت گہری ہو گئی ہے!"

کبھی کبھی بے تکلّفی سے بلا کے کہتا ہے "یار بھولو
تم اپنے دفتر کی میز کی داہنی طرف کی دراز میں رکھ کے
بھول آئے ہو مسکراہٹ
جہاں پہ پوشیدہ ایک فائل رکھی تھی تم نے
وہ مسکراہٹ بھی اپنے ہونٹوں پہ چسپاں کرلو

اس آئینے کو پلٹ کے دیوار کی طرف بھی لگا چکا ہوں
یہ چپ تو ہو جاتا ہے مگر پھر بھی دیکھتا ہے
یہ آئینہ دیکھتا بہت ہے!
یہ آئینہ بولتا بہت ہے!!

ایک پشیمانی رہتی ہے
اُلجھن اور گرانی بھی _____
آؤ پھر سے لڑ کر دیکھیں
شاید اس سے بہتر کوئی اور سبب مل جائے ہم کو
پھر سے الگ ہو جانے کا!!

الجھن

رات کو اکثر ہوتا ہے، پروانے آ کر،
ٹیبل لیمپ کے گرد اکٹھے ہو جاتے ہیں،
سنتے ہیں، سر دُھنتے ہیں
سن کے سب اشعار غزل کے
جب بھی مَیں دیوانِ غالب کھول کے پڑھنے بیٹھتا ہوں
صبح پھر دیوان کے روشن صفحوں سے
پروانوں کی راکھ اُٹھانی پڑتی ہے!!

غالب

یاد ہے، بارشوں کا دن پنجم
جب پہاڑی کے نیچے وادی میں
دھند سے جھانک کر نکلتی ہوئی
ریل کی پٹریاں گذرتی تھیں
دھند میں ایسے لگ رہے تھے ہم
جیسے دو پودے پاس بیٹھے ہوں
ہم بہت دیر تک وہاں بیٹھے
اس مسافر کا ذکر کرتے رہے

جس کو آنا تھا پچھلی شب، لیکن
جس کی آمد کا وقت ٹلتا رہا
دیر تک پٹریوں پہ بیٹھے ہوئے
ٹرین کا انتظار کرتے رہے
ٹرین آئی، نہ اس کا وقت ہوا
اور تم یوں ہی دو قدم چل کر
دھند پر پاؤں رکھ کے چل بھی دیئے!
میں اکیلا ہوں دھند میں پنچم!

۱۔ آر، ڈی، برمن کا نام

ٹینس میچ میں دیکھنے والوں کی گردن جب دائیں بائیں چلتی ہے
دائیں طرف مَیں تم کو دیکھا کرتا تھا!

بارش میں جب وِمبلڈن رک جاتا تھا
اک بھیگی چھتری کے نیچے
رین کوٹ میں گرما گرم کافی کی سانسیں
اٹھ اٹھ کر چشمہ دھندلا کر جاتی تھیں
بھاپ کے فلٹر میں تم ''واٹر پینٹنگ'' جیسی لگتی تھیں!

روز اسی ''کافی کاؤنٹر'' سے ''چپس اینڈ برگر'' لے کر
سینٹر کورٹ تک آنا ـــــــ
روز اسی دہلیز پہ آ کر
پَیر اُلارتے رہتے تھے دہلیز پہ لیکن ـــــــ
دونوں جانتے تھے دہلیز کو پار نہیں کر سکتے ہم!
مجھ کو لوٹ آنا تھا ہندوستان میں، اور تم کو امریکہ جانا تھا
دونوں طرف ـــــــ دو گھر تھے اور دو سورج تھے!!

وِمبلڈن

تارپن تیل میں کچھ گھولی ہوئی دھوپ کی ڈلیاں
میں نے کینوس پہ بکھیری تھیں----- مگر
کیا کروں، لوگوں کو اس دھوپ میں رنگ دِکھتے نہیں

مجھ سے کہتا تھا تھیو، چرچ کی سروس کرلوں
اور اس گرجے کی خدمت میں گزاروں میں شب و روز جہاں
رات کو سایہ سمجھتے ہیں سبھی، دن کو سَرابوں کا سفر
مادے کی جو بھی حقیقت ہے نظر آتی نہیں ہے ان کو
میری تصویروں کو کہتے ہیں----- تخیل ہیں،
یہ سب واہمہ ہیں
میرے کینوس پہ بنے پیڑ کی تفصیل تو دیکھیں
میری تخلیق خداوند کے اس پیڑ سے کچھ کم تو نہیں

اس نے تو بیج کو اک حکم دیا تھا شاید
پیڑ اس بیج کی ہی کوکھ میں تھا، اور نمایاں بھی ہوا
جب کوئی ٹہنی جھکی، پتہ گرا، رنگ اگر زرد ہوا
تو مصوّر نے کہاں دخل دیا
جو ہُوا ہے سو ہُوا

میں نے ہر شاخ پہ، ہر پتے کی تشکیل پہ محنت کی ہے
اس حقیقت کو بیاں کرنے میں جو حسن حقیقت ہے،
حقیقت کے سوا کچھ بھی نہیں

ان درختوں کا یہ سنبھلا ہوا قد تو دیکھو
کیسے خوددار ہیں یہ پیڑ مگر کوئی بھی مغرور نہیں
ان کو شعروں کی طرح میں نے کیا ہے موزوں
دیکھو، تانبے کی طرح کیسے دہکتے ہیں خزاں کے پتّے

"کوئلہ کانوں" میں جھونکے ہوئے مزدوروں کی شکلیں
لالٹینیں ہیں جو شب دیر تلک جلتی رہیں

آلوؤں پر جو گزر کرتے ہیں کچھ لوگ ''پوٹیٹو ایٹرز''
ایک بتی کے تلے ایک ہی ہالے میں بندھے لگتے ہیں سارے

میں نے دیکھا تھا' ہوا کھیتوں سے جب بھاگ رہی تھی
اپنے کینوس پہ اسے روک لیا
رولاں' وہ چٹھی رساں' اور وہ اسکول میں پڑھتا لڑکا
زرد خاتون' پڑوسن تھی مری
فانی لوگوں کو تغیر سے بچا کر' انہیں کینوس پہ تواریخ
کی عمریں دی ہیں!

سالہا سال یہ تصویریں بنائیں میں نے
میرے نقاد مگر بولے نہیں
ان کی خاموشی کھٹکتی تھی مرے کانوں میں
اس پہ تصویر بناتے ہوئے اک کوے کی وہ چیخ پکار
کو اُکھڑکی پہ نہیں' سیدھا مرے کان پہ آبیٹھتا تھا'
کان ہی کاٹ دیا ہے میں نے!

POTATO EATERS

میرے پیلیٹ ۱ ' پہ رکھی دھوپ تو اب سوکھ گئی
"تارپن" تیل میں اک گھولا تھا سورج میں نے

آسماں اس کا بچھانے کے لیے لیکن اس وقت
چند بالشت کا کینوس بھی مرے پاس نہیں

میں یہاں ریمی میں ہوں
"سینٹ ریمی" ۲ کے دواخانے میں تھوڑی سی مرمت
کے لیے بھرتی ہوا ہوں
ان کا کہنا ہے کئی پرزے مرے ذہن کے
کچھ ٹھیک نہیں
مجھے لگتا ہے وہ پہلے سے سوا تیز ہیں اب!

وین گوگ کا ایک خط

ST REMY-2 PALAT-1

اک سناٹا بھرا ہوا تھا
ایک غبارے سے کمرے میں
تیرے فون کی گھنٹی کے بجنے سے پہلے
باسی سا ماحول یہ سارا
تھوڑی دیر کو دھڑکا تھا
سانس ہلی تھی، نبض چلی تھی
مایوسی کی جھلّی آنکھوں سے اتری کچھ لمحوں کو
پھر تیری آواز کو آخری بار "خدا حافظ" کہہ کے جاتے دیکھا تھا!
اک سناٹا بھرا ہوا ہے
جسم کے اسی غبارے میں
تیرے آخری فون کے بعد ــــــ!!

غبارے

آٹھ ہی ''بلیمین'' عمر زمیں کی ہوگی شاید
ایسا ہی اندازہ ہے کچھ سائنس کا
چار عشاریہ چھ بلیمین سالوں کی عمر تو بیت چکی ہے
کتنی دیر لگا دی تم نے آنے میں
اور اب مل کر
کس دنیا کی دنیا داری سوچ رہی ہو
کس مذہب اور ذات اور پات کی فکر لگی ہے
آؤ چلیں اب ——

دیر آید..... تین ہی بلیمین سال بچے ہیں!

ورتھ، جو سینٹ ہے مٹی کا
ورتھ جو تم کو بھلا لگتا ہے
ورتھ، کے سینٹ کی خوشبو تھی تھیٹر میں، گئی رات کے شو میں
تم کو دیکھا تو نہیں، سینٹ کی خوشبو سے نظر آتی رہیں تم!

دو دو فلمیں تھیں، بیک وقت جو پردے پہ رواں تھیں
پردے پر چلتی ہوئی فلم کے ساتھ
اور اک فلم مرے ذہن پہ بھی چلتی رہی
اینا کے رول میں جب دیکھ رہا تھا تم کو
ٹالسٹائی، کی کہانی میں ہماری بھی کہانی کے سِرے جُڑنے لگے

سوکھی مٹی پہ چٹکتی ہوئی بارش کا وہ منظر
گھاس کے سوندھے ہرے رنگ
جسم کی مٹی سے نکلی ہوئی خوشبو کی وہ یادیں
منظرِ رقص میں سب دیکھ رہے تھے تم کو
اور میں پاؤں کے اس زخمی انگوٹھے پہ بندھی پٹی کو
شاٹ کے فریم میں جو آئی نہ تھی
اور وہ چھوٹا اداکار جو اس رقص میں بے وجہ تمہیں چھو کے
گذرتا تھا جسے جھڑکا تھا میں نے
میں نے کچھ شاٹ تو کٹوا بھی دیئے تھے اُس کے
کہرے کے سین میں سچ مچ ہی ٹھٹھرتی ہوئی محسوس ہوئیں
حالانکہ یاد ہے گرمی میں بڑے کوٹ سے الجھی تھیں بہت تم
اور مصنوعی دھوئیں نے جو کئی آفتیں کی تھیں
ہنس کے اتنا بھی کہا تھا تم نے
"اتنی سی آگ ہے اور اس پہ دھوئیں کو جو گماں ہوتا ہے وہ کتنا بڑا ہے"

برف کے سین میں اتنی ہی حسیں تھیں کل رات

جتنی اس رات تھیں، فلما کے پہلگام سے جب لوٹے تھے
اور ہوٹل میں خبر تھی کہ تمہارے شوہر
صبح کی پہلی فلائٹ سے وہاں پہنچے ہیں

رات کی رات بہت کچھ تھا جو تبدیل ہوا
تم نے اس رات بھی کچھ گولیاں کھا لینے کی کوشش کی تھی
جس طرح فلم کے آخر میں بھی اینا کیری نینا
خودکشی کرتی ہے اک ریل کے نیچے آکر

آخری سین میں جی چاہا کہ میں روک دوں اس ریل کا انجن
آنکھیں بند کرلیں کہ معلوم تھا وہ "اینڈ" ! مجھے
پس منظر میں بلکتی ہوئی موسیقی نے اس رشتے کا انجام سنایا
جو کبھی باندھا تھا ہم نے
"ورتھ" کے سینٹ کی خوشبو تھی تھیٹر میں گئی رات بہت!

END-1

اینا کیری نینا

نظامِ جہاں پڑھ کے دیکھو تو کچھ اس طرح چل رہا ہے!
عراق اور امریکہ کی جنگ چھڑنے کے امکان پھر بڑھ گئے ہیں
"الف لیلہ" کی داستاں والا وہ شہر بغداد بالکل تبہ ہو چکا ہے!
خبر ہے، کسی شخص نے گنجے سر پر بھی اب بال اگانے کی اک پیسٹ ایجاد کی ہے
کپل دیو نے چار سو وکٹوں کا اپنا ریکارڈ قائم کیا ہے
خبر ہے کہ شہزادی ڈائینا اور چارلس اب کرسمس سے پہلے الگ ہو رہے ہیں
کروشا اور سلوانیا بھی الگ ہونے ہی کے لئے لڑ رہے ہیں
پلاسٹک پہ دس فی صدی ٹیکس پھر بڑھ گیا ہے

یہ پہلی نومبر کی خبریں ہیں ساری
نظامِ جہاں اس طرح چل رہا ہے!
مگر یہ خبر تو کہیں بھی نہیں ہے
کہ تم مجھ سے ناراض بیٹھی ہوئی ہو!
نظامِ جہاں کس طرح چل رہا ہے؟

خبر ہے

میں کچھ کچھ بھولتا جاتا ہوں اب تجھ کو
ترا چہرہ بھی دھندلانے لگا ہے اب تخیّل میں
بدلنے لگ گیا ہے اب وہ صبح و شام کا معمول جس میں
تجھ سے ملنے کا بھی اک معمول شامل تھا
تیرے خط آتے رہتے تھے تو مجھ کو یاد رہتے تھے تری آواز کے سر بھی
تری آواز کو کاغذ پہ رکھ کے، میں نے چاہا تھا کہ "پن" کر لوں
وہ جیسے تتلیوں کے پر لگا لیتا ہے کوئی اپنی البم میں
ترا "ب" کو دبا کر بات کرنا، "واؤ" پر ہونٹوں کا چھلّا گول
ہو کر گھوم جاتا تھا
بہت دن ہو گئے دیکھا نہیں، نہ خط ملا کوئی
بہت دن ہو گئے سچی
تری آواز کی بوچھاڑ میں بھیگا نہیں ہوں میں!!

بوچھاڑ

اک نظم

یہ راہ بہت آسان نہیں
جس راہ پہ ہاتھ چھڑا کر تم
یوں تن تنہا چل نکلی ہو!
اس خوف سے شاید، راہ بھٹک جاؤ نہ کہیں
ہر موڑ پہ میں نے نظم کھڑی کر رکھی ہے!

تھک جاؤ اگر
اور تم کو ضرورت پڑ جائے
اک نظم کی انگلی تھام کے واپس آ جانا!

اگر ایسا بھی ہو سکتا---

تمہاری نیند میں سب خواب اپنے منتقل کر کے

تمہیں وہ سب دکھا سکتا، جو میں خوابوں میں اکثر دیکھا کرتا ہوں!

یہ ہو سکتا اگر ممکن

تمہیں معلوم ہو جاتا

تمہیں میں لے گیا تھا، سرحدوں کے پار دِینہ میں

تمہیں وہ گھر دکھایا تھا---- جہاں پیدا ہوا تھا میں

جہاں چھت پر لگا سریوں کا جنگلا، دھوپ سے دن بھر
مِرے آنگن میں شطرنجی بناتا تھا، مٹاتا تھا

دکھائی تھیں تمہیں وہ کھیتیاں سرسوں کی، دِینے میں، کہ جس کے
پیلے پیلے پھول تم کو خواب میں کچّے کھلائے تھے
وہیں اک راستہ تھا "ٹہلیوں" کا، جس پہ میلوں تک پڑا کرتے تھے
جھولے سوندھے ساون کے
اُسی کی سوندھی خوشبو سے، مہک اٹھتی ہیں آنکھیں
جب کبھی اس خواب سے گزروں

تمہیں رہتاس کا چلتا کنواں، بھی تو دکھایا تھا
قلعے میں بندر رہتا تھا جو دن بھر، رات کو گاؤں میں آجاتا تھا

کہتے ہیں--------

تمہیں کالا سے کالووال تک لے کر اُڑا ہوں میں
تمہیں دریائے جہلم پر عجب منظر دکھائے تھے
جہاں تربوز پر لیٹے ہوئے تیراک لڑکے بہتے رہتے تھے
جہاں تگڑے سے اک سردار کی پگڑی پکڑ کر میں

نہاتا، ڈبکیاں لیتا، مگر جب غوطہ آجاتا تو میری نیند کھل جاتی

مگر یہ صرف خوابوں ہی میں ممکن ہے
وہاں جانے میں اب دشواریاں ہیں کچھ سیاست کی
وطن اب بھی وہی ہے، پر نہیں ہے ملک اب میرا
وہاں جانا ہو اب تو دو دو سرکاروں کے دَسیوں دفتروں سے
شکل پر، لگوا کے مُہریں، خواب ثابت کرنے پڑتے ہیں!!

اگر ایسا بھی ہو سکتا...

۱۔ شاعر کا پیدائشی قصبہ ضلع جہلم (پنجاب)

۲۔۳۔۴۔ یہ سب ضلع جہلم کے معروف مقامات ہیں۔

ہلسا

ہلدی اور سیندور لگا کے
شگن میں 'ہلسا ماچھ' آئی ہے۔
کتنی سندر ہیں مچھی کی سُرمئی آنکھیں!
اس کی آنکھیں ملتی ہیں اس لڑکی سے
'ٹائمز' کے پہلے پیج پہ جو تصویر ٹنگی تھی،
ٹالی گنج میں جس لڑکی نے
تنگ آ کے سسرال سے، آتم ہتیا کی تھی!!

اک اداکار ہوں مَیں!
مَیں اداکار ہوں ناں
جینی پڑتی ہیں کئی زندگیاں ایک حیاتی میں مجھے!

میرا کردار بدل جاتا ہے، ہر روز ہی سیٹ پر
میرے حالات بدل جاتے ہیں
میرا چہرہ بھی بدل جاتا ہے، افسانہ و منظر کے مطابق
میری عادات بدل جاتی ہیں!
اور پھر داغ نہیں چھوٹتے پہنی ہوئی پوشاکوں کے

نصیر الدین شاہ کے لیے

خستہ کرداروں کا کچھ چُورا سا رہ جاتا ہے تہہ میں
کوئی نوکیلا سا کردار گزرتا ہے رگوں سے تو خراشوں
کے نشاں دیر تلک رہتے ہیں دل پر
زندگی سے یہ اٹھائے ہوئے کردار خیالی بھی نہیں ہیں کہ اتر
جائیں وہ پنکھے کی ہوا سے
سیاہی رہ جاتی ہے سینے میں، ادیبوں کے لکھے جملوں کی
سیمیں پردے پہ لکھی
سانس لیتی ہوئی تحریر نظر آتا ہوں
میں اداکار ہوں لیکن
صرف اداکار نہیں
وقت کی تصویر بھی ہوں!!

نُچے چھیلے گئے کُہسار نے کوشش تو کی
گرتے ہوئے اک پیڑ کو روکے
مگر کچھ لوگ کندھوں پر اٹھا کر اس کو ——
پگڈنڈی کے رستے لے گئے تھے
کارخانے میں
فلک کو دیکھتا ہی رہ گیا پتھرائی آنکھوں سے

"بہت نوچی ہے میری کھال انساں نے
بہت چھیلے ہیں میرے سر سے جنگل اس کے تیشوں نے
مرے دریاؤں، میرے آبشاروں کو بہت ننگا کیا ہے
اِس ہوس آلود انساں نے
مرا سینہ تو پھٹ جاتا ہے لاوے سے
مگر انسان کا سینہ نہیں پھٹتا
وہ پتھر ہے!

کُہسار

رات

مری دہلیز پر بیٹھی ہوئی زانو پہ سر رکھے
یہ شب افسوس کرنے آئی ہے کہ میرے گھر پہ
آج ہی جو مر گیا ہے دن
وہ دن ہمزاد تھا اس کا!
وہ آئی ہے کہ میرے گھر میں اس کو دفن کر کے
اک دیا دہلیز پر رکھ کر
نشانی چھوڑ دے کہ محو ہے یہ قبر
اس میں دوسرا آکر نہیں لیٹے

میں شب کو کیسے بتلاؤں
بہت سے دن مرے آنگن میں یوں آدھے اَدھُورے سے
کفن اوڑھے پڑے ہیں کتنے سالوں سے
جنہیں میں آج تک دفنا نہیں پایا!!

دو بجنے میں آٹھ منٹ تھے
جب وہ بھاری بوریوں جیسی ٹانگوں سے بلڈنگ کی پھت پر پہنچا تھا
تھوڑی دیر کو چھت کے فرش پہ بیٹھ گیا تھا

چھت پر ایک کباڑی گھر تھا
سُوکھا سُکڑا تلّے والا' سود نچوڑو جاگیرے کا جو تاوہ پہچانتا تھا
اس بلڈنگ میں جس کا جو سامان مرا' بیکار ہوا' وہ اوپر
لا کے پھینک گیا

اس کے پاس تو کتنا کچھ تھا
کتنا کچھ جو ٹوٹ چکا تھا' ٹوٹ رہا تھا

شوہر اور وطن کی چھوڑی ہمشیرہ کل پاکستان سے بچے لے کر
لوٹ آئی ہے

سب کے سب کچھ خالی بوتلوں ڈبوں جیسے لگتے ہیں
بچے، ٹیڑھے، بن لیبل کے!

صبح بھی دیکھا، بوڑھی دادی سوئی ہوئی تھی ——— مری نہیں تھی
جب دوپہر کو پانی پی کر، چھت پر آیا وہ تو تب بھی
مری نہیں تھی ——— سوئی ہوئی تھی
جی چاہا اس کو بھی لا کر چھت پر پھینک دے، جیسے ٹوٹے
ایک پلنگ کی پشت پڑی ہے

دور کسی گھڑیال نے ساڑھے چار بجائے
دو بجنے میں آٹھ منٹ تھے جب وہ چھت پر آیا تھا
سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے اس نے سوچ لیا تھا
جب اس پار ٹریفک لائٹ بدلے گی
رک جائیں گی ساری کاریں
تب وہ پانی کی ٹنکی کے اوپر چڑھ کے "پیراپیٹ" پر
اترے گا اور چودھویں منزل سے کودے گا

اس کے بعد اندھیرے کا اک وقفہ ہو گا
کیا وہ گرتے گرتے آنکھیں بند کرے گا؟

یا آنکھیں کچھ اور زیادہ پھٹ جائیں گی؟
یا بس ——— سب کچھ بجھ جائے گا؟
گرتے گرتے بھی اس نے لوگوں کا اک کہرام سنا تھا
اور لہو کے چھینٹے اڑ کر، پوپٹ کی دوکان کے اوپر تک جاتے
بھی دیکھ لئے تھے!

رات کا ایک بجا تھا جب وہ سیڑھیوں سے پھر نیچے اترا
اور دیکھا فٹ پاتھ پہ آکر
چاک سے کھینچا، لاش کا نقشہ وہیں پڑا تھا، جس کو
اس نے چھت کے ایک کباڑی گھر سے پھینکا تھا!

اور اچانک
تیز ہوا کے جھونکے نے کمرے میں آکر ہلچل کر دی
پردے نے لہرا کے میز پہ رکھی ڈھیر سی کانچ کی چیزیں الٹی کر دیں
پھڑ پھڑ کر کے ایک کتاب نے جلدی سے منہ ڈھانپ لیا
ایک دوات نے غوطہ کھا کے
سامنے رکھے جتنے کورے کاغذ تھے، سب کو رنگ ڈالا
دیواروں پر لٹکی تصویروں نے بھی حیرت سے گردن ترچھی
کر کے دیکھا تم کو!

پھر سے آنا ایسے ہی تم
اور بھر جانا کمرے میں!

خوش آمدید!

کپل وستو دور نہیں ہے
کپل نگر کے باہر جنگل کچھ چھدرا چھدرا لگتا ہے
کیا لوگوں نے سوکھنے سے پہلے ہی کاٹ دیئے ہیں پیڑ
یا شاخیں ہی جلد اتر جاتی ہیں اب ان پیڑوں کی؟

کپل نگر سے باہر جاتے اس کچّے رستے سے آخر کون گیا ہے
رستہ اب تک ہانپ رہا ہے!
اس مٹی کی تہ کے نیچے
میرے رتھ کے پہیوں کی پُرشور کھرونچیں
ان راہوں کو یاد تو ہوں گی

بُدھّم شرنم گچھّامی کا جاپ مسلسل جاری ہے
آنندن اور راگھو کے ہونٹوں پر

جو میرے ساتھ چلے آئے ہیں-----!
ان کے ہونے سے مَن میں کچھ ساہس بھی ہے
"ساہس" اور "ڈر" ایک ہی سانس کے سُر ہیں دونوں
آروہی، اور روہی جیسے چلتے ہیں
اور اَنا یہ میری کہ میں رہبر ہوں

تیاگی بھی ہوں
راج پاٹ کا تیاگ کیا ہے، پَتنی اور سنتان کے ہوتے
کیا یہ بھی ایک اَنا ہے میری؟
یا چہرے پر جُڑا ہُوا یہ دو آنکھوں کا ایک ترازو
کیا کھویا، کیا پایا تولتا رہتا ہے

شہر کی سیما پر آتے ہی، سانس کی لَے میں فرق آیا ہے
پنجرے میں اک بے چینی نے پر پھڑکے ہیں!
جاتے وقت یہ پگڈنڈی تو
باہر کی جانب اٹھ اٹھ کر دیکھا کرتی تھی!
لوٹتے وقت یہ پاؤں پکڑ کے
گھر کی جانب کیوں مڑتی ہے

میں سدھارتھ تھا جب اس برگد کے نیچے چولا بدلا تھا
بارہ سال میں کتنا پھیل گیا ہے گھیرا اس برگد کا
قد بھی اب اونچا لگتا ہے۔۔۔۔!

☆ راہل کا قد کیا میری نابی تک ہو گا؟
مجھ پر ہے تو کان بھی اس کے لمبے ہوں گے
ماں نے چھدوائے ہوں شاید
رنگ اور آنکھیں لگتا تھا' ماں سے پائی ہیں
راج کنور ہے' گھوڑا دوڑاتا ہو گا اب
یشؔ کیا رتھ پر جانے دیتی ہو گی اس کو؟
بدّھم شرنم گچھّامی' اور دھم شرنم گچھّامی

یہ جاپ مسلسل سنتے سنتے
اب لگتا ہے' جیسے "منتر" نہیں' چیتاونی ہے یہ
"مکتی راہ" سے باہر آنا
اب اتنا ہی مشکل ہے' جتنا سنسار سے باہر جانا مشکل تھا

کیوں لوٹا ہوں۔۔۔۔۔؟

کیا تھا جو میں چھوڑ گیا تھا

کون سا چھاج بکھیر گیا تھا، اور بٹورنے آیا ہوں میں؟

اٹھتے اٹھتے شاید میری جھولی سے

سمبندھ بھرا اک تھال گرا تھا

گونج ہوئی تھی، لیکن میں ہی وہ آواز پھلانگ آیا تھا

ہر سمبندھ بندھا ہوتا ہے

دو سمتوں سے۔۔۔۔۔ دونوں سروں سے

ایک سرا تو کھول گیا تھا!

دوسرا کھلوانا باقی تھا!

شاید اب اس مَن کی گرہ کو کھولنے لوٹ کے آیا ہوں میں

آگے پیچھے چلتے میرے چیلوں کی آوازیں کہتی رہتی ہیں

محصور ہو تم، تم قیدی ہو، اس "منتر" کے

جو تم نے خود ہی پراپت کیا ہے!

بدّھم شرنم گچھّامی، اور دھم شرنم گچھّامی!

راکھ

سلاخوں کے پیچھے پڑے انقلابی کی آنکھوں میں بھی
راکھ اترنے لگی ہے!
دہکتا ہوا کوئلہ دیر تک جب نہ پھونکا گیا ہو
تو شعلے کی آنکھوں میں بھی
موتیے کی سفیدی اتر آتی ہے!

خودکشی

بس اک جھگڑے کا لمحہ تھا

در و دیوار پر ایسے چھناکے سے گری آواز جیسے کانچ گرتا ہے
ہر اک شے میں گئیں اُڑتی ہوئی، جلتی ہوئی کرچیں
نظر میں، بات میں، لہجے میں، سوچ اور سانس کے اندر
لہو ہونا تھا اک رشتے کا---- سو وہ ہو گیا اُس دن!!
اسی آواز کے ٹکڑے اٹھا کے فرش سے اُس شب
کسی نے کاٹ لیں نبضیں
نہ کی آواز تک کچھ بھی
کہ کوئی جاگ نہ جائے!

وادیٔ کشمیر

سلیم عارف کے نام

بڑی اداس ہے وادی
گلا دبایا ہوا ہے کسی نے انگلی سے
یہ سانس لیتی رہے، پر یہ سانس لے نہ سکے!

درخت اگتے ہیں کچھ سوچ سوچ کر جیسے
جو سر اٹھائے گا پہلے وہی قلم ہو گا
جھکا کے گردنیں آتے ہیں ابر نادم ہیں
کہ دھوئے جاتے نہیں خون کے نشاں ان سے!

ہری ہری ہے، مگر گھاس اب ہری بھی نہیں
جہاں پہ گولیاں برسیں، زمیں بھری بھی نہیں
وہ مائیگریٹری پنچھی جو آیا کرتے تھے
وہ سارے زخمی ہواؤں سے ڈر کے لوٹ گئے
بڑی اداس ہے وادی---- یہ وادیِ کشمیر!

رات تعمیر کریں

اک رات چلو تعمیر کریں
خاموشی کے سنگ مرمر پر
ہم تان کے تاریکی سر پر
دو شمعیں جلائیں جسموں کی!
جب اوس، دبے پاؤں اترے
آہٹ بھی نہ پائے سانسوں کی

کہرے کی ریشمی خوشبو میں
خوشبو کی طرح ہی لپٹے رہیں
اور جسم کے سوندھے پردوں میں
روحوں کی طرح لہراتے رہیں!!

''دائرے کی اسیری'' (احمد ندیم قاسمی) نے بہت متاثر کیا تھا۔ اس کا ایک ثبوت اس شمارے میں جناب ستیہ پال آنند کی نظم سے ملا: ''آسمانی ایلچی سے ایک مکالمہ۔'' دو بڑے شاعروں کے بیچ بولنا گستاخی ہے لیکن دو استادوں کے سامنے اپنے سوال اور ردِ عمل تو رکھ ہی سکتا ہوں۔

ارتقا کی کون سی منزل ہے یہ؟
جستجو کی کون سی حد ہے؟
"گریویٹی" کی قرنوں کی اسیری کھول کر باہر نکلنے کی سعی ہے
صرف پہلی بار اس سطحِ زمیں سے ایڑیاں اُچکی ہیں ہم نے
باقی دنیاؤں کی مخلوقات سے واقف ہی کب تھے

باقی مخلوقات کا اندازہ ہو تو آگے سوچیں
کب کہا تھا اس نے، مخلوقات میں اشرف ہیں ہم
کیا کسی کو یاد ہے، وہ کس جگہ ہم سے ملا تھا؟
وہ کوئی آواز تھی، یا بس علامت تھی کوئی، جس کی کہ
ہم نے خود ہی اک تشریح کر ڈالی!
کہ ہم اپنی ہی حیرت کو خدا کا نام دے کر جی رہے ہیں!
کائنات اک بیکراں کالا سمندر
کائنات اک گہرا اور اندھا کنواں، اور اس میں
گردن ڈال کر آوازیں دیتے جا رہے ہیں
اور جو سنتے ہیں، وہ لَوٹی ہوئی اپنی صدا ہے
اپنی ہی آواز سے مسحور لگتے ہیں

"سرشٹی" کے سبھی اَسرار کھلتے جا رہے ہیں
اور گرتی جا رہی ہیں چادریں افلاک کی
اور جستجو کا یہ سفر تو اب شروع ہونے لگا ہے
ہر قدم قَرنوں میں اٹھتا ہے یہاں
ارتقا کی ابتدائی منزلیں ہیں!

یہ پڑاؤ ہے زمیں پر
نسل بھی یہ ابتدائی ہے
جسم یہ جھڑتے رہیں گے
جس طرح پیڑوں سے پتّے
صرف اک قطرہ "انرجی" کا بالآخر
نور کی اک بوند لے کر
وسطِ کائنات تک جانا ہے ہم کو!

زمین پر پڑاؤ

---

* سرشٹی = تخلیق

سکیچ

یاد ہے اک دن
میرے میز پہ بیٹھے بیٹھے
سگریٹ کی ڈبیہ پر تم نے
چھوٹے سے اک پودے کا
ایک اسکیچ بنایا تھا
آ کر دیکھو
اس پودے پر پھول آیا ہے!

یہ منظر پہلے دیکھا ہے
فوج کی فوج کھڑی ہے جم کر
بندوقیں تانے کندھوں پر
اور ہجوم اک لوگوں کا باہیں لہراتا
شاید اُنیس سو اُنیس، اور امرتسر ہے
جلیانوالہ باغ سے ملتا جلتا ہے

یا اُنیس سو چھتیس میں لاہور کا منظر
تحریکِ آزادی کے اس سالانہ جلسے کا دن ہے
اس تصویر میں کتنا کچھ جانا پہچانا سا لگتا ہے
ان لوگوں کے چہرے بھی پہچانے سے ہیں
ان چہروں پر مایوسی اور غصّے کی تحریریں بھی
ان کی عمریں، ان کے جذبے
میں ان سب سے واقف ہوں

ہو سکتا ہے، سن اُنیس سو بیالیس تھا اور الہ آباد تھا
چوک کے بیچوں بیچ بنے اس گول جزیرے کے جنگلے میں

فوج کی فوج کھڑی تھی جم کر
دائیرہ کھینچے، بندوقیں تانے کندھوں پر
اور ہجوم اک لوگوں کا، باہیں لہراتا
بلّی بلّی ہاتھ اُچھلتے ہوئے ہوا میں، مٹھیاں بھینچے
لوگوں کے ہاتھوں میں تب بھی
ایسا ہی اک جھنڈا تھا
نعروں کی آواز یہی تھی
اسی طرح سے چلی تھی گولی
اس طرح کچھ لوگ گرے تھے
اسی سڑک پر خون بہا تھا
چوک کے بیچوں بیچ مگر، اس لوہے کے جنگلے کے اندر
اک انگریز کا بُت تھا پہلے
اب گاندھی کی مورتی ہے

ایک منظر.....

لیکن اب تو
سن اُنیس سو بانوے ہے!

جس بستی میں آگ لگی تھی کل کی رات
اُس بستی میں میرا کوئی نہیں رہتا تھا

عورتیں، بچّے، مرد کئی اور عمر رسیدہ لوگ سبھی
وہ جن کے سر پہ شعلے اور شہتیر گرے
اُن میں میرا کوئی نہیں تھا

ایک سکول جو کچّا پکّا تھا، اور بنتے بنتے خاک ہوا
جس کے ملبے میں وہ سب کچھ دفن ہوا، جو اس بستی کا
مستقبل کہلاتا تھا

اس اسکول میں
میرے گھر سے کوئی کبھی پڑھنے نہ گیا
اور نہ اب جاتا تھا
میری کوئی دوکان نہیں تھی
میرا کوئی سامان نہیں تھا
دور ہی دور سے دیکھ رہا تھا
کیسے کچھ خفیہ ہاتھوں نے جا کر آگ لگائی تھی

جب سے دیکھا ہے یہ خوف بسا ہے دل میں
میری بستی بھی ویسی ہی ایک ترقی کرتی، بڑھتی بستی ہے
اور ترقی یافتہ کچھ لوگوں کو ایسی کوئی بات پسند نہیں!!

بادلوں میں مجھے کچھ اُڑتی ہوئی بھیڑیں نظر آتی ہیں
دُمبے دِکھتے ہیں کبھی بھالو سے کُشتی لڑتے
ڈھیلی سی پگڑی میں اک بڈھا مجھے دیکھ کے حیران سا ہے

کوئی گزرا ہے وہاں سے شاید
دھوپ میں ڈوبا ہوا برش لے کر
برفوں پر رنگ چھڑکتا ہوا--- جس کے قطرے
پیڑوں کی شاخوں پہ بھی جا کے گرے ہیں

دوڑ کے آتی ہے بے چین ہوا جھاڑنے رنگیں چھینٹے
اونچے، جاٹوں کی طرح صف میں کھڑے پیڑ ہلا دیتی ہے

اور اک دھندلے سے کُہرے میں کبھی
موٹریں نیچے اترتی ہیں پہاڑوں سے تو لگتا ہے
چادریں پہنے ہوئے، دو دو صفوں میں
پادری شمعیں جلائے ہوئے جاتے ہیں عبادت کے لیے

کلّو کی وادی میں ہر روز یہی ہوتا ہے
شام ہوتے ہی اتر آتا ہے بادل نیچے
اوڑھنی ڈال کے منظر پہ، منادی کرنے
آج دن بھر کی نمائش تھی، یہیں ختم ہوئی!

کلّو وادی

اُسے پھر لَوٹ کر جانا ہے، یہ معلوم تھا اس وقت بھی جب شام کی
سرخ و سنہری ریت پر وہ دوڑتی آئی تھی اور لہرا کے
یوں آغوش میں بکھری تھی جیسے پورے کا پورا سمندر
لے کے اُمڈی ہے

اسے جانا ہے وہ بھی جانتی تو تھی
مگر ہر رات پھر بھی ہاتھ رکھ کر چاند پر کھاتے رہے قسمیں
نہ میں اتروں گا اب سانسوں کے ساحل سے

نہ وہ اترے گی میرے آسماں پر جھولتے تاروں کی پینگوں سے
مگر جب کہتے کہتے داستاں، پھر وقت نے لمبی جمائی لی
نہ وہ ٹھہری
نہ میں ہی روک پایا تھا!

بہت پھونکا سلگتے چاند کو پھر بھی اسے اِک اِک کلا گھٹتے ہوئے دیکھا
بہت کھینچا سمندر کو مگر ساحل تلک ہم لا نہیں پائے!
سحر کے وقت پھر اُترے ہوئے ساحل پہ اک ڈوبا ہوا خالی سمندر تھا!

خالی سمندر

سفیدہ چیل جب تھک کر کبھی نیچے اترتی ہے
پہاڑوں کو سناتی ہے پرانی داستانیں پچھلے پیڑوں کی

وہاں دیودار کا اک اونچے قد کا، پیڑ تھا پہلے
وہ بادل باندھ لیتا تھا کبھی پگڑی کی صورت اپنے پتوں پر
کبھی دوشالے کی صورت اُسی کو اوڑھ لیتا تھا
ہوا کی تھام کر باہیں
کبھی جب جھومتا تھا، اُس سے کہتا تھا
مرے پاؤں اگر جکڑے نہیں ہوتے، میں تیرے ساتھ ہی چلتا

اُدھر شیشم تھا، اس کیکر سے کچھ آگے
بہت لڑتے تھے وہ دونوں
مگر سچ ہے کہ کیکر اس کے اونچے قد سے جلتا تھا
سریلی سیٹیاں بجتی تھیں جب شیشم کے پتّوں میں
پرندے بیٹھ کر شاخوں پہ، اس کی نقلیں کرتے تھے

وہاں اک آم بھی تھا
جس پہ اک کوئل کئی برسوں تلک آتی رہی جب بُور آتا تھا
ادھر دو تین تھے جو گل مہر، اب ایک باقی ہے
وہ اپنے جسم پر کھودے ہوئے ناموں کو ہی سہلاتا رہتا ہے
ادھر اک نِیم تھا
جو چاندنی سے عشق کرتا تھا
نشے میں نیلی پڑ جاتی تھیں، ساری پتّیاں اس کی

ذرا اور اُس طرف پرلی پہاڑی پر
بہت سے جھاؤ تھے، جو لمبی لمبی سانسیں لیتے تھے

مگر اب ایک بھی دِکھتا نہیں ہے اُس پہاڑی پر
کبھی دیکھا نہیں، سنتے ہیں، اُس وادی کے دامن میں
بڑے برگد کے گھیرے سے بڑی اک چمپا رہتی تھی
جہاں سے کاٹ لے کوئی، وہیں سے دودھ بہتا تھا
کئی ٹکڑوں میں بیچاری گئی تھی اپنے جنگل سے

سفیدہ چیل اک سوکھے ہوئے سے پیڑ پر بیٹھی
پہاڑوں کو سناتی ہے پرانی داستانیں اونچے پیڑوں کی
جنھیں اس پست قد انساں نے کاٹا ہے، گرایا ہے
کئی ٹکڑے کیے ہیں اور جلایا ہے

مرثیہ

کیا لئے جاتے ہو تم کندھوں پہ یارو
اس جنازے میں تو کوئی بھی نہیں ہے!
درد ہے کوئی، نہ حسرت ہے، نہ غم ہے
مسکراہٹ کی علامت نہ کوئی آہ کا نقطہ؟
کوئی تحریر نگاہوں کی، نہ آواز کا قطرہ؟
کیا لیے جاتے ہو تم کندھوں پہ

صرف مٹّی ہے یہ مٹّی
مٹّی کو مٹّی میں دفناتے ہوئے
روتے کیوں ہو؟

وہ دوست کل گذر گیا
وہ دوست اب نہیں رہا
غروبِ آفتاب کے
سنہری پیڑ کے تلے
جہاں وہ روز ملتا تھا
وہیں پہ دفن کر دیا
میں نیم اندھیری قبر میں
سُلا رہا تھا جب اسے

تو نیم وا نگاہ سے
وہ دیکھتا رہا مجھے
ہتھیلیوں سے آنکھ کے
چراغ بھی بجھا دیئے
کہ دو جہاں کے سلسلے
زمیں پہ ہی چکا دیئے
میں جب وہاں سے لَوٹا تو
وہ ساتھ ساتھ آگیا
وہ دوست جو نہیں رہا
جو دوست کل گذر گیا!

امجد خان

---

* امجد خاں

وہ پل کی ساتویں سیڑھی پہ بیٹھا کہتا رہتا تھا:
کسی تھیلے میں بھر کے گر خیال اپنے
میں دروازے پہ ہرکارے کی صورت جا کے پہنچاتا
چمکتی بوندیں بارش کی، کسی کی جیب میں بھر کے
گلے میں بادلوں کا ایک مفلر ڈال کر آتا
وہ بھیگا بھیگا سا رہتا!
کسی کے کان میں دو بالیوں سے چاند پہناتا

مچھیروں کی کوئی لڑکی اگر ملتی
گرجتے بادلوں کو باندھ کر بالوں کے جُوڑے میں
دھنک کی "بینی" دے آتا---!
مجھے گر کہکشاں کو بانٹنے کا حق دیا ہوتا' خدا نے تو

کوئی فٹ پاتھ سے بولا
"ابے اولاد شاعر کی
بہت کھائی ہیں روکھی روٹیاں میں نے
جو لا سکتا ہے تو--- اک بار کچھ سالن ہی لا کر دے!!"

شاعر

گیٹ کے اندر جاتے ہی، اک حوض خاص ہے
سینکڑوں قصّوں کی کائی سے بھرا ہوا ہے
چاروں جانب چھ سو سال پرانے سائے سوکھ رہے ہیں
گزرے وقت کی تمثیلوں پر
گائیڈ ورق لگا کر ماضی بیچ رہا ہے!!

ماضی کے اُس گیٹ کے باہر
ہاتھوں کی ریکھائیں رکھ کے پٹڑی پر
''پنجانوں'' کا جوتشی کوئی
مستقبل کی پڑیاں باندھ کے بیچ رہا ہے!

ماضی --- مستقبل

''پنچان'' جیوتش کی کتاب جس میں ستاروں کے گھر دیکھے پڑھے جاتے ہیں)۔

پیچھے، شام کے ہلدی رنگ آکاش کی چادر
سامنے بجلی کے دو لمبے تار کھچے ہیں!
ان پر کالے کالے پنچھی
ایسے دھیان لگائے بیٹھے رہتے ہیں
جیسے کوئی ہندی کے اکھشر لا کر رکھ جاتا ہے!
شام پڑے ہی
روزانہ کوئی راج کوی ان تاروں پر
اک دوہا لکھ جاتا ہے!

ہوا محل جے پور

کبھی کبھی، جب میں بیٹھ جاتا ہوں اپنی نظموں کے سامنے
نصف دائرے میں - - -
مزاج پوچھوں
کہ ایک شاعر کے ساتھ کٹتی ہے کس طرح سے؟
وہ گھُور کے دیکھتی ہیں مجھ کو
سوال کرتی ہیں: اُن سے میں ہوں؟
یا مجھ سے ہیں وہ؟
وہ ساری نظمیں کہ میں سمجھتا ہوں وہ مرے "جِین"
سے ہیں لیکن

وہ یوں سمجھتی ہیں اُن سے ہے میرا ناک نقشہ
یہ شکل ان سے ملی ہے مجھ کو!
مزاج پوچھوں میں کیا؟ کہ اک نظم آگے آتی ہے
چھو کے پیشانی پوچھتی ہے:
بتاؤ گر انتشار ہے کوئی سوچ میں تو؟
میں پاس بیٹھوں؟
مدد کروں اور بِین دوں الجھنیں تمہاری؟
اداس لگتے ہو' ایک کہتی ہے پاس آ کر
جو کہہ نہیں سکتے تم کسی کو
تو میرے کانوں میں ڈال دو راز اپنی سرگوشیوں کے لیکن
گر اک سنے گا' تو سب سنیں گے!
بھڑک کے کہتی ہے ایک ناراض نظم مجھ سے
میں کب تک اپنے گلے میں لوں گی تمہاری آواز کی خراشیں؟
اک اور چھوٹی سی نظم کہتی ہے:
"پہلے بھی کہہ چکی ہوں شاعر
چڑھان چڑھتے اگر تری سانس پھول جائے تو میرے کندھوں پہ
رکھ دے کچھ بوجھ میں اٹھالوں

وہ چپ سی اک نظم پیچھے بیٹھی جو ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہتی
ہے مجھے ——— بس
نہ جانے کیا ہے کہ اس کی آنکھوں کا رنگ تم پر چلا گیا ہے!
الگ الگ ہیں مزاج سب کے
مگر کہیں نہ کہیں وہ سارے مزاج مجھ میں بسے ہوئے ہیں
میں ان سے ہوں یا -------
مجھے یہ احساس ہو رہا ہے
جب ان کو تخلیق دے رہا تھا
وہ مجھ کو تخلیق دے رہی تھیں!!

جنگل

ہے سوندھی ترش سی خوشبو دھوئیں میں
ابھی کاٹی ہے جنگل سے
کسی نے گیلی ہی لکڑی جلائی ہے
تمھارے جسم سے سرسبز گیلے پیڑ کی خوشبو نکلتی ہے!

گھنیرے کالے جنگل میں
کسی دریا کی آہٹ سن رہا ہوں میں
کوئی چپ چاپ چوری سے نکل کے جا رہا ہے
کبھی تم نیند میں کروٹ بدلتی ہو تو بل پڑتا ہے دریا میں!

تمھاری آنکھ میں پرواز دکھتی ہے پرندوں کی
تمھارے قد سے اکثر آبشاروں کی بلندی یاد آتی ہے

مجھے واگھا پہ ٹوبہ ٹیک سنگھ والے بشن سے جا کے ملنا ہے
سنا ہے وہ ابھی تک سُوجے پیروں پر کھڑا ہے جس جگہ منٹو نے چھوڑا تھا
وہ اب تک بڑبڑاتا ہے
اپر دی گڑگڑ دی منگ دی دال دی لالٹین

پتہ لینا ہے اس پاگل کا
اونچی ڈال پر چڑھ کر جو کہتا تھا
خدا ہے وہ
اُسی کو فیصلہ کرنا ہے کس کا گاؤں کس حصّے میں جائے گا
وہ کب اترے گا اپنی ڈال سے
اس کو بتانا ہے
ابھی کچھ اَور بھی دل ہیں
کہ جن کو بانٹنے کا، کاٹنے کا کام جاری ہے

وہ بٹوارہ تو پہلا تھا

ابھی کچھ اَور بٹوارے بھی، باقی ہیں!!

مجھے واگھا پہ ٹوبہ ٹیک سنگھ والے بشن سے جا کے

ملنا ہے

خبر دینی ہے اس کے دوست افضل کو

وہ لہنا سنگھ، ودھاوا سنگھ، وہ بھین امرت

جو سارے قتل ہو کر اس طرف آئے تھے

ان کی گردنیں سامان ہی میں

لٹ گئیں پیچھے

ذبح کر دے وہ "بھُوری" اب کوئی لینے نہ آئے گا!

وہ لڑکی ایک انگلی جو بڑی ہوتی تھی ہر بارہ مہینوں میں

وہ اب ہر اک برس اک پوٹا پوٹا گھٹتی رہتی ہے

بتانا ہے کہ سب پاگل ابھی پہنچے نہیں اپنے ٹھکانوں پر

بہت سے اِس طرف ہیں اور بہت سے اُس طرف بھی ہیں

مجھے واگھا پہ ٹوبہ ٹیک سنگھ والا بشن اکثر یہی کہہ کے بلاتا ہے

اِیر دی گڑگڑ دی منگ دی دال دی لالٹین،

دی ہندوستان تے پاکستان دی درپھٹے منہ!

ٹوبہ ٹیک سنگھ

دیر تک بیٹھے ہوئے دونوں نے بارش دیکھی

وہ دکھاتی تھی مجھے بجلی کے تاروں پہ لٹکتی ہوئی بوندیں
جو تعاقب میں تھیں اک دوسرے کے
اور اک دوسرے کو چھوتے ہی تاروں سے ٹپک جاتی تھیں
مجھ کو یہ فکر کہ بجلی کا کرنٹ
چھو گیا ننگی کسی تار سے تو آگ کے لگ جانے کا باعث ہو گا

اس نے کاغذ کی کئی کشتیاں پانی پر اتاریں
اور یہ کہہ کے بہا دیں کہ سمندر میں ملیں گے

مجھ کو یہ فکر کہ اس بار بھی سیلاب کا پانی
کود کے اترے گا کہسار سے جب
توڑ کے لے جائے گا یہ کچے کنارے!

اوک میں بھر کے وہ برسات کا پانی
ادھ بھری جھیلوں کو ترساتی رہی
وہ بہت چھوٹی تھی، کمسن تھی، وہ معصوم بہت تھی
آبشاروں کے ترنم پہ قدم رکھتی تھی اور گونجتی تھی
اور میں عمر کے افکار میں گم
تجربے ہمراہ لیے
ساتھ ہی ساتھ میں بہتا ہوا، چلتا ہوا، بہتا گیا!!

دونوں

وہی گلی تھی....

میں اپنے بزنس کے سلسلے میں
کبھی کبھی اس کے شہر جاتا ہوں تو گذرتا ہوں اُس گلی سے
وہ نیم تاریک سی گلی
اور اسی کے نکڑ پہ اونگھتا سا
پرانا کھمبا
اسی کے نیچے تمام شب انتظار کر کے
میں چھوڑ آیا تھا شہر اس کا

بہت ہی خستہ سی روشنی کے عصا کو ٹیکے
وہ کھمبا اب بھی وہیں کھڑا ہے!
فتور ہے یہ، مگر میں کھمبے کے پاس جا کر
نظر بچا کے محلّے والوں کی
پوچھ لیتا ہوں آج بھی یہ
وہ میرے جانے کے بعد بھی، آئی تو نہیں تھی؟
وہ آئی تھی کیا؟

بڑی سی ایک لڑکی تھی
مرا بستہ پکڑ کے، اور دروازے کے پیچھے کھینچ کر مجھ کو
مرے بستے سے اس نے گاچنی مٹّی چرائی تھی
کُتر کے دانت سے وہ مسکرائی تھی!
مرے گالوں پہ پپّی لے کے بولی تھی
"مجھے دے دے یہ مٹّی!
مجھ کو تختی پوت کر اک نام لکھنا ہے!"
"وہ کوئی حاملہ ہو گی!" مجھے ماں نے بتایا تھا!

مَیں شاید چھ برس کا تھا
مَیں اب چھپّن برس کا ہوں
مَیں اب بھی حاملہ ہوں یاد سے اس کی
دِینہ میں..... وہ لڑکی اب بھی مجھ کو یاد آتی ہے!!

دیوار کے بیچوں بیچ جڑی اک چَورس کھڑکی
اک چَورس آکاش کا ٹکڑا تھام کے بیٹھی رہتی ہے!

اتنے سے آکاش کے سیمیں پردے پر
دن اور رات کے کتنے منظر آتے ہیں' اور جاتے ہیں
صبح صبح جب روشنی "فیڈ اِن" ہوتی ہے
اور پس منظر میں چڑیوں کی آوازیں گونجنے لگتی ہیں
شاخ پہ لٹکا جامنی رنگ کا پھول اترتا ہے اوپر سے
جھول جھول کے کرتب دکھلا کے پھر' اوپر اٹھ جاتا ہے
اور کبھی اس شاخ پہ اک بادامی چڑیا
پھول کے ساتھ نظر آتی ہے پردے پر
دونوں میں کچھ ہے' لگتا ہے
بیاہے بیاہے سے لگتے ہیں!

جب منظر تبدیل ہوتا ہے
اونچے اونچے شملوں والے گبھرو بادل

کالے کالے گھوڑوں کے رتھ دوڑاتے ہیں
لگتا ہے سب رَن بھومی کی اور چلے ہیں
نیزے بھالے، تلواروں کے ٹکرانے سے بجلی کوندتی رہتی ہے

پھر
یُدھ کا منظر چھَٹ جاتا ہے
سرخ لہو بھی سندھوری ہوتے ہوتے، پھر کالا پڑنے لگتا ہے
سب تصویریں گھُل جاتی ہیں

کشتی کھیتے کھیتے، پھر سیمیں پردے پر چاند آتا ہے
مالکونس کی دُھن پر، ساما، ساما، گاسا، گاتے گاتے تارے بھی بھر جاتے ہیں

منظر تو چلتا رہتا ہے
میری دونوں آنکھیں جب تک نیند میں ڈوبنے لگتی ہیں
ہسپتال کے
اک چوکور سے، کمرے کی دیوار کے بیچوں بیچ جڑی اک چورس کھڑکی
اک چورس آکاش کا ٹکڑا تھامے بیٹھی رہتی ہے!

یُدھ

عمر اک "سپول" پہ لپٹی ہوتی ----- یا لپٹتی جاتی
اور تصویریں شب و روز کی محفوظ بھی ہو جاتیں
سبھی "ٹیپ" کے اوپر
میں ترے دردوں کو دوبارا سے جینے کے لئے
روز دوہراتا انہیں، روز "ری وائینڈ" کرتا
اور جو برسوں جیا تھا، اسے ہر شب جیتا!

وڈیو

پَت جھڑ

جب جب پت جھڑ میں پیڑوں سے پیلے پیلے
پتّے میرے لان میں آکر گرتے ہیں
رات کو چھت پر جا کر میں
آکاش کو تکتا رہتا ہوں
لگتا ہے کمزور سا پیلا چاند بھی شاید
پیپل کے سوکھے پتّے سا
لہراتا لہراتا میرے لان میں آکر اترے گا!!

اور سمندر مرگیا

اور سمندر مرگیا، اُس رات، جب
اس کے ساحل سے لگی تھی اک چٹان
بس وہاں سے کود کر جاں دے دی اُس مہتاب نے!
جس کا چہرہ دیکھ کر طوفان اٹھتے تھے سمندر میں کبھی
اس کے پاؤں کی گلابی ایڑیوں کے نیچے اپنی
بلبلاتی جھاگ کے نمدے بچھانے کے لئے
ساحلوں پر سر پٹخ دیتی تھیں لہریں----- لیٹ جاتی تھیں

لوٹ کر اپنے اُفق پر
غرق سب لہریں ہوئیں
اور سمندر مرگیا اُس رات جب
اس کے ساحل سے لگی تھی اک چٹان
بس وہاں سے کود کر جاں دے دی اُس مہتاب نے!

کبھی پربت کی اونچی چوٹیوں پر جب
دھوئیں جیسے گھنے بادل سلگتے ہیں
مجھے پربت بہت بے چین لگتے ہیں

ہوائیں پربتوں کے جنگلوں میں، بَین کرتی دوڑتی ہیں جب
پتہ چلتا ہے کہ پربت پریشاں ہیں
بڑے ناراض لگتے ہیں وہ جب اپنی چٹانوں کو
اٹھا کر خندقوں میں پھینک دیتے ہیں
زمیں ہلتی ہے جب پاؤں پٹختے ہیں
انہیں اچھا نہیں لگتا، سرنگیں کھود کے سینے میں ان کے
جب کوئی بارود کے گولے اڑاتا ہے!

پربت

یہ سات رنگی دھنک کون چڑھ کے صاف کرے
ہزار جالے لگے ہیں، سیاہ لگتی ہے
کوئی امید اگر اڑ کے چھو بھی لے اس کو
تو گرد اڑتی ہے، یا رنگ بھرنے لگتے ہیں
فلک کھلا تھا تو سوچا کہ دھوپ نکلے گی
یہ "داغ داغ اجالا" بھی چھٹ ہی جائے گا
مگر اس آدھی صدی میں
پرانی چھت کا سا لگتا ہے آسمان مجھے
مریض لگتی ہیں صبحیں، ضعیف لگتا ہے سورج

درخت اتنے گرے ہیں پرانے اور گھنے
پرندے ڈرتے ہیں شاخوں پہ تنکے رکھتے ہوئے
عقیدے توڑے ہیں اتنے زیادہ لوگوں نے
چلیں جو چار قدم، تلوے کٹنے لگتے ہیں
میں کس امید کے پر کھولوں اور اڑاؤں اسے
یہ سات رنگی دھنک کون چڑھ کے صاف کرے

آج کا دن جب میرے گھر میں فوت ہوا
جسم کی رنگت جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی تھی
سرخ خراشیں رینگ رہی تھیں باہوں پر
پلکیں جھلسی جھلسی سی، اور چہرہ دھجی دھجی تھا
ہاتھ میں تھے کچھ چیتھڑے سے اخباروں کے
لب پر ایک شکستہ سی آواز تھی بس
"دیکھ ذرا، ان بارہ چودہ گھنٹوں میں کیا حالت کی ہے دنیا نے!"

دن

بے یار و مددگار ہی کاٹا تھا سارا دن
کچھ خود سے اجنبی سا
تنہا اداس سا
ساحل پہ دن بجھا کے میں لوٹ آیا پھر وہیں
سنسان سی سڑک کے خالی مکان میں!

دروازہ کھولتے ہی میز پہ رکھی کتاب نے
ہلکے سے پھڑپھڑا کے کہا:
"دیر کر دی دوست!"

دوست!

بیمار یاد

اک یاد بڑی بیمار تھی کل
کل ساری رات اس کے ماتھے پر
برف سے ٹھنڈے چاند کی پٹی رکھ رکھ کر
اک اک بُوند دلاسا دے کر
از حد کوشش کی اس کو زندہ رکھنے کی
پَو پھٹنے سے پہلے لیکن
آخری ہچکی لے کر وہ خاموش ہوئی

اک قبر

اک قبر میں رہتا ہوں!
اس قبر کی آنتیں ہیں
اس قبر میں جو کچھ بھی
لا کر دفناتا ہوں
یہ ہضم تو کرتی ہے
منہ بند نہیں کرتی!

چھ فٹ سے ذرا کم ہے!
کتنا کچھ دفنایا
بھرتی ہی نہیں کمبخت!
جس قبر میں رہتا ہوں!

چاند لاہور کی گلیوں سے گزر کے اک شب
جیل کی اونچی فصیلیں چڑھ کے
یوں "کمانڈو" کی طرح کود گیا تھا "سیل" میں،
کوئی آہٹ نہ ہوئی
پہرے داروں کو پتہ ہی نہ چلا

فیض سے ملنے گیا تھا، یہ سنا ہے
فیض سے کہنے، کوئی نظم کہو
وقت کی نبض رکی ہے
کچھ کہو
وقت کی نبض چلے!

زنداں نامہ

CELL

چاند کے نام "سمن"*

روز آتا ہے یہ بہروپیا، اک روپ بدل کر
رات کے وقت دکھاتا ہے کلائیں اپنی
اور لبھا لیتا ہے معصوم سے لوگوں کو ادا سے!
پورا ہرجائی ہے،
پورا ہرجائی ہے گلیوں سے گزرتا ہے، کبھی چھت سے بجاتا ہوا سیٹی
روز آتا ہے جگاتا ہے بہت لوگوں کو شب بھر
آج کی رات اُفق سے کوئی
چاند نکلے تو گرفتار ہی کر لو اس کو!!

---

* سمن Summon

"زیرو کس" کرا کے رکھی ہے کیا رات اس نے؟
ہر رات وہی نقشہ اور نقطے تاروں کے
ہر رات وہی تحریر لڑھکتے سیاروں کی
اسرار وہی، افسوں بھی وہی
ہر رات انھی تاروں پہ قدم رکھ رکھ کے یہاں تک آتا ہوں!

آکاش کے نوٹس بورڈ پہ کیوں
ہر روز وہی ٹنگ جاتی ہے
زیرو کس! "زیرو کس" کرا کے رکھی ہے کیا رات اس نے؟

ایک اور دن

دن کا کیکر کاٹ کاٹ کے کلہاڑی سے
رات کا ایندھن جمع کیا ہے!
سیلی لکڑی، کڑوے دھوئیں سے
چولھے کی کچھ سانس چلی ہے!
پیٹ پہ رکھی، چاند کی چکّی،
ساری رات میں پیسوں گا
ساری رات اُڑے گا پھر آکاش کا چُورا!!
صبح کو پھر جنگل میں جا کر
سورج کاٹ کے لانا ہو گا!

کہاں سے ڈھونڈوں میں ہاتھ اپنے
کہ میرے ہاتھوں پہ اور لوگوں نے ہاتھ اپنے چڑھا دیئے ہیں
کہ میرے اعمال بھی کسی اور کا عمل ہیں!
میں جو بھی کرتا ہوں اور لوگوں کی انگلیاں آ کے جڑنے لگتی ہیں انگلیوں سے
جبیں سے اپنا پسینہ پونچھوں، تو غیر کی ناک چھو کے جاتا ہے ہاتھ میرا

عجیب ہے یہ نظام جس میں
نظام نے کاٹ کر مرے ہاتھ
قاعدوں اور ڈھیروں قانونی فائلوں میں چھپا دیئے ہیں!
کہاں سے ڈھونڈوں میں ہاتھ اپنے
کہ میرے ہاتھوں پہ اور لوگوں نے ہاتھ اپنے چڑھا دیئے ہیں!!

میرے ہاتھ

بارش آتی ہے تو پانی کو بھی لگ جاتے ہیں پاؤں
در و دیوار سے ٹکرا کے گذرتا ہے گلی سے
اور اُچھلتا ہے چھپاکوں میں
کسی میچ میں جیتے ہوئے لڑکوں کی طرح

جیت کر آتے ہیں جب میچ گلی کے لڑکے
جوتے پہنے ہوئے کینوس کے
اُچھلتے ہوئے گیندوں کی طرح
در و دیوار سے ٹکرا کے گذرتے ہیں
وہ پانی کے چھپاکوں کی طرح-----!

مون سون

اِس فٹ پاتھ پہ رہنا اب مشکل ہے دوست
سوچتا ہوں فٹ پاتھ بدل لوں
پہلے سا اب شرم لحاظ نہیں لوگوں میں
نہ پہلے سی دنیا داری
وہ بھی دن تھے آس پڑوس میں پوچھ لیا کرتے تھے
گر کوئی بھوکا ہی سو جائے تو
اب تو جیبیں کٹ جاتی ہیں سوتے میں
اَور تو اَور کہ سر کے نیچے رکھے، رات کو جوتے بھی چوری
ہو جاتے ہیں_____
میں جب آیا تھا اس شہر میں
آٹھ آنے لیتا تھا اس پاڑے کا دادا

پاڑہ = محلّہ۔ دادا = غنڈا (ممبئی کی زبان میں)

اور دونی ہفتے کی، یہ وردی والا
اتنی بھیڑ نہیں ہوتی تھی
بھک منگے بھی کم ہوتے تھے
دھندے والے لوگ تھے سارے
کوئی ہمال تھا ''گودی'' میں، پنواڑی کوئی
کچھ ایرانی ہوٹل کے لونڈے تھے، آ کر سو جاتے تھے
پھوکٹ کے نعرے لگوانے والے نیتا لوگ نہیں تھے
پہلے کے جو نیتا تھے ناں ——— باٹا کے جوتوں جیسے تھے
سالوں سال چلا کرتے تھے
''پاور'' والے لوگ تھے سارے
چٹکی میں دشمن کا کانٹا کھینچ دیا کرتے تھے، سالا!
اب تو آیا اور گیا
سب کچرپٹی!

میرے دنوں میں ———
عورت ذات ''مُلک'' میں رکھ کر آتے تھے مزدوری کرنے
کوئی بیٹی، بڑھیا، ساتھ میں آ جاتی تو
سب ''عجبت'' سے دیکھتے تھے
کوئی سالا لفڑا نہ تھا!
کیا کچھ ہوتا ہے اب، چھی چھی!

اب فٹ پاتھ پہ رہنے میں بھی ''رِسک'' بہت ہے
جب سے ہندو مسلم دنگے کروانے کی رِیت چلی ہے سیاست میں
پاڑوں کے دادا بھی آ کر دھرم پتہ کر جاتے ہیں
کس سالے کو دھرم پتہ ہے؟
یاد کِسے ہے؟
کتنے سال ہوئے اپنے کو؟
جب سے ٹانگ کٹی تھی ایکسیڈینٹ میں سالی
گاڑی والا پی کے جب فٹ پاتھ کے اوپر چڑھ آیا تھا
مل کی نوکری چُھوٹ گئی تھی
تب سے یہ بیساکھی لے کر
جھاڑن بیچ کے
ٹیکسی دھو کر دن کٹتے ہیں!

چھوڑ گیا فٹ پاتھ یہ آخر، جھمرو لنگڑا
چَوپاٹی کے پُل سے کود کے اس نے اپنی جاں دے دی ہے

فٹ پاتھ

تعاقب

لاکھ دنوں کے بعد میں جب بھی تجھ سے مل کر آتا ہوں
پیچھے پیچھے آتی تیری دو آنکھوں کی چاپ سنائی دیتی ہے
کئی دنوں تک یوں لگتا ہے
میں چاہے جس راہ سے گزروں
دیکھ رہی ہو گی تُو مجھ کو!

کتنا عرصہ ہوا کوئی اُمید جلائے
کتنی مدت ہوئی کسی قندیل پہ جلتی روشنی رکھے
چلتے پھرتے اس سنسان حویلی میں
تنہائی سے ٹھوکر کھا کے
کتنی بار گرا ہوں میں ــــــ!

چاند گھر

چاند اگر نکلے تو اب اس گھر میں روشنی ہوتی ہے
ورنہ اندھیرا رہتا ہے!

سوناں!

ذرا آواز کا لہجہ تو بدلو
ذرا مدّھم کرو اس آنچ کو سوناں!
کہ جل جاتے ہیں کنگرے نرم رشتوں کے
ذرا الفاظ کے ناخن تراشو
بہت چبھتے ہیں جب ناراضگی سے بات کرتی ہو!

پوسٹ بکس آج بھی خالی ہی رہا
آخری خط کو بھی آئے ہوئے کچھ سال ہوئے
ڈاکیا ہنستا ہے!
"اب کون لکھے گا تجھے چٹھی بابا؟
موت آئے گی تو مولا ہی کا خط لائے گی، اب تو!"

اپنے ہی ہاتھ سے لکھنا مرے مولا مجھ کو
ہچکی آتی ہے تو لگتا ہے کہ دستک آئی
خط نہیں آتا کوئی
ہر مہینے
فقط اک بجلی کا بل
پانی کا نوٹس
جو بہر حال چلا آتا ہے!

پوسٹ بکس

بُڑھیا، تیرے ساتھ تو میں نے، جینے کی ہر شے بانٹی ہے
دانہ پانی، کپڑا لتا، نیندیں اور جگراتے سارے
اولادوں کے جننے سے بسنے تک، اور بچھڑنے تک
عمر کا ہر حصہ بانٹا ہے
تیرے ساتھ جدائی بانٹی، روٹھ، صلح، تنہائی بھی
ساری کارستانیاں بانٹیں، جھوٹ بھی اور سچائی بھی
میرے درد سہے ہیں تو نے
تیری ساری پیڑیں میری پوروں میں سے گذری ہیں
ساتھ جیئے ہیں
ساتھ مریں یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟
دونوں میں سے ایک کو اک دن
دوجے کو شمشان میں چھوڑ کے
تنہا واپس لوٹنا ہو گا!!

بُڑھیا رے

سوئمنگ پُول

گرمی سے کل رات اچانک آنکھ کھلی تو
جی چاہا کہ ''سوئمنگ پُول'' کے ٹھنڈے پانی میں اک
ڈُبکی مار کے آؤں
باہر آ کر ''سوئمنگ پُول'' پہ دیکھا تو حیران ہوا
جانے کب سے ـــــــ
بن پوچھے اک چاند آیا اور میرے پُول میں، آنکھیں بند کیے
لیٹا تھا، تیر رہا تھا!
اُف! کل رات بہت گرمی تھی!!

کل تجھے سیر کرائیں گے سمندر سے لگی گول سڑک کی
رات کو ہار سا لگتا ہے سمندر کے گلے میں
"گھوڑا گاڑی" پہ بہت دور تلک سیر کریں گے
گھوڑے کی ٹاپوں سے لگتا ہے کہ کچھ دیر کے راجہ ہیں ہم
"گیٹ وے آف انڈیا" پر دیکھیں گے ہم تاج محل ہوٹل
جوڑے آتے ہیں ولایت سے ہنی مون منانے، تو ٹھہرتے ہیں وہیں پر!

آج کی رات تو فٹ پاتھ پہ اینٹیں رکھ کر
گرم کر لیتے ہیں بریانی جو ایرانی کے ہوٹل سے ملی ہے
آج کی رات منالیں گے ہنی مون یہیں زینے کے نیچے!!

ہنی مون

اُس رات

اُس رات بہت سنّاٹا تھا
اس رات بہت خاموشی تھی
سایا تھا نہ کوئی سرگوشی، آہٹ تھی نہ جُنبش تھی کوئی
ہاں دیر تلک اُس رات مگر
بس ایک مکاں کی دوسری منزل پر اک روشن کھڑکی اور
اک چاند فلک پر اک دوجے کو ٹکٹکی باندھے تکتے رہے!!

بزرگوں کے کمرے سے ہوتا ہوا
سیڑھیوں سے گذر کے
دبے پاؤں چھت پر چلا آیا تھا میں!

میں آیا تھا تم کو جگانے، چلو بھاگ جائیں
اندھیرا ہے اور سارا گھر سو رہا ہے
یہی وقت ہے ---- صبح کی پہلی گاڑی کا وقت ہو رہا ہے
وہ پچھلے سٹیشن سے چھوٹی نہیں ہے
وہاں سے جو چھوٹے گی تو گارڈ اک لمبی سی کوک دے گا
اسی منہ اندھیرے میں گاؤں کے "ٹی ٹی" سے بچتے بچاتے
دو شالوں کی بکل میں چہرے چھپائے
نکل جائیں گے ہم!

مگر تم بڑی میٹھی سی نیند میں سو رہی تھیں
دبی سی ہنسی تھی لبوں کے کناروں پہ مہکی ہوئی
گلے پر اک ادھڑا ہوا تاگا' کرتی سے نکلا ہوا
سانس چھو چھو کے بس کپکپائے چلا جا رہا تھا
طربیں سانسوں کی بجتی ہوئی ہلکی ہلکی
ہوا جیسے سنتور کے تار پر میڑھ لیتی ہوئی
بہت دیر تک میں وہ سنتا رہا
بہت دیر تک ہونٹ آنکھوں پہ رکھ کے' تمہارے
کسی خواب کو پیار کرتا رہا میں
نہیں جاگیں تم----- اور میری جگانے کی ہمت نہیں ہو سکی
لوٹ آیا!

سیڑھیوں سے اتر کے
بزرگوں کے کمرے سے ہوتا ہوا

مجھے کیا پتہ تھا کہ ماموں کے گھر سے اسی روز وہ تم کو لے جائیں گے!!
تمہیں چھوڑ کے' زندگی اک الگ موڑ مڑ جائے گی!!

"بابا بگلوس کا تعویذ ہے یہ
بابا بگلوس کی رحمت سے ملا ہے
اس کو پہنو گے تو ہر خطرے سے محفوظ رہو گے
شرط یہ ہے کہ سدا جسم کو یہ چھوتا رہے
پاؤں کے نیچے دبے دفن خزانوں کی خبر دے گا تمہیں

رات کو تکیے کے نیچے رکھ لو
صرف چالیس دنوں میں ہی بدل دیتا ہے قسمت
دل کی پوشیدہ تمناؤں کی تکمیل کرا دیتا ہے!"

بابا بگلوس۔۱

شہر کے مفلس و معذور غریبوں کے مقدّر کو بدلنے کے لئے
ایک فٹ پاتھ پہ وہ بیٹھا ہوا بیچ رہا تھا
آٹھ آٹھ آنے میں کچھ معجزے جینے کے لئے!

بابا بگلوس جناب مستنصر حسین تارڑ کے افسانے کا ایک کردار ہے

"بابا بگلوس" کو ان چیخوں کے پتھر نہیں سونے دیتے
جیلیں خاموش ہیں اور شہروں میں ہنگامے ہیں
گرم لوہے کے توّے جیسی یہ سڑکیں، جن پر
لوگ دانوں کی طرح گرتے ہی بھُن جاتے ہیں
آنکھوں، کانوں سے مکانوں کے دھوُاں اٹھتا ہے
جوتوں کی نوکوں پہ ہر روز لڑھکتے ہیں سروں کے کاسے،
فرقے لڑتے ہیں سیاست میں تو ہر "گول" پہ اک شور سا مچ جاتا ہے
کوڑے لہراتے ہیں جب کیرے ڈانسر کی طرح
کھال "ویفر" کی طرح اُڑتی نظر آتی ہے
ٹانکے کھل جائیں کسی منہ کے تو سی دیتی ہیں سنگینیں انھیں

بابا بگلوس کا کہنا ہے، شریفوں کے لیے رہنے کو اب شہر نہیں ہے
اس سے بہتر ہے کہ جیلوں میں بُلا لیں ان کو
جتنے مجرم ہیں، انھیں جیلوں سے باہر کر دیں!

بابا بگلوس۔۲

کھڑکی پچھواڑے کی کھلتی تو نظر آتا تھا
وہ املتاس کا اک پیڑ، ذرا دور، اکیلا سا کھڑا تھا
شاخیں پنکھوں کی طرح کھولے ہوئے
اک پرندے کی طرح

ورغلاتے تھے اسے روز پرندے آکر
جب سناتے تھے وہ پرواز کے قصّے اس کو
اور دکھاتے تھے اسے اڑ کے، قلابازیاں کھا کے
بدلیاں چھُو کے بتاتے تھے، مزے ٹھنڈی ہوا کے!

آندھی کا ہاتھ پکڑ کر شاید
اس نے کل اُڑنے کی کوشش کی تھی
اوندھے منہ بیچ سڑک جا کے گرا ہے!!

املتاس

پہاڑ کی آگ

لال سنہری، جھلمل کرتی آگ کو میں نے،
جلدی جلدی دور پہاڑ کی چوٹی پر چڑھتے دیکھا تھا،
ویسے ہی جیسے دوشالا اوڑھے بنّو
پرلی وادی سے ماہی کی بولی سن کر
ننگے پاؤں دوڑی تھی
پھر اُس آگ کو اونچے اونچے چیڑ کے پیڑوں پر چڑھتے بھی دیکھا تھا
تیز ہوا میں دیر تلک لہرا لہرا کر،
برف سے پھُوٹے ایک نئے چشمے کو پاس بلاتی رہی
"آجا، میرے لب لگ جا، میں پیاسی ہوں-----"
بنّو کا پردیسی ماہی لوٹ آیا تھا
گوٹے والی لال سنہری آگ کے پاس نہ آیا کوئی
پیڑوں سے جب اُتری تو بجھتے چہرے پر راکھ ملی تھی!

اک عمارت

ہے سرائے شاید

جو مرے سر میں بسی ہے

سیڑھیاں چڑھتے اترتے ہوئے جوتوں کی دھمک

بجتی ہے سر میں

کونوں کھدروں میں کھڑے لوگوں کی سرگوشیاں

سنتا ہوں کبھی

سازشیں، پہنے ہوئے کالے لبادے سر تک

اڑتی ہیں----- بھوتیا محلوں میں اڑا کرتی ہیں

چمگادڑیں جیسے

اک محل ہے شاید
ساز کے تار چٹختے ہیں نسوں میں
کوئی کھول کے آنکھیں
پتیاں پلکوں کی جھپکا کے بلاتا ہے کسی کو!
چولہے جلتے ہیں تو مہکی ہوئی گندم کے دھوئیں میں
کھڑکیاں کھول کے کچھ چہرے مجھے دیکھتے ہیں
اور سنتے ہیں جو میں سوچتا ہوں!

ایک مٹی کا ہے گھر
اک گلی ہے، جو فقط گھومتی ہی رہتی ہے
شہر ہے کوئی، مرے سر میں بسا ہے شاید!

اک عمارت

وہ لاش جو چوک میں پڑی ہے
نہ سر پہ ٹوپی، نہ جوتا پیروں میں، جیبیں خالی
نہ نام ہے، نہ پتہ ٹھکانا
بس اک لفافہ ملا ہے جس میں لکھا ہوا تھا
میں اس جہاں سے گزر رہا تھا
بڑا کٹھن تھا مگر یہاں ایک رات رکنا
سوالوں سے گھٹ گئی تھیں سانسیں
میں جا رہا ہوں

تلاش جاری ہے، سر سے پاؤں تلک کہ آخر،
مُرا تو کس چیز سے مُرا ہے،
نشان گولی کا، زخم کوئی----؟
کسی نے مارا؟
کہ دل کا دورہ پڑا اچانک؟

یا زہر کھا کے وہ زندگی کے خلاف کوئی گلہ تھا جو درج کر گیا ہے
تلاش جاری ہے، گر مراسم خدا سے تھے بھی تو گفتگو کس زبان میں تھی؟
وہ کون ہے جس کی معرفت وہ عدم گیا ہے؟
نہ چوٹی سر پر، نہ سجدے کا ماہتاب ماتھے پہ ہے
کڑا نہیں ہے کلائی میں اور نہ ہے گلے میں صلیب کوئی
جلائیں اس کو کہ دفن کر دیں؟

عدم کو جانا بھی اتنا آساں نہیں ہے ہمدم

جو دیکھ سکتے کہ خط گیا، پر لفافے کی چھان بین جاری ہے
اور تفتیش ہو رہی ہے

وہ لاش

بارش

پانی کا پیڑ ہے بارش، جو پہاڑوں پہ اُگا کرتا ہے
شاخیں بہتی ہیں، اُمڑتی ہوئی، بل کھاتی ہوئی
برف کے بیج گرا کرتے ہیں
جھرنے پکتے ہیں تو جھمکوں کی طرح جھولنے لگتے ہیں
بہستانوں پر
بیلیں گرتی ہیں چھتوں سے!
موسمی پیڑ ہے، موسم میں اُگا کرتا ہے

ہوائیں جالیوں سے جب گذرتی ہیں
تو کٹ جاتی ہیں جالی سے
ہواؤں کے بدن سے ٹوٹ کر گرتی ہے جب پرواز
تو اک چیخ کی آواز ہوتی ہے

فتح پور سیکری کی جالیوں سے آج بھی اکثر
کٹی پرواز کی آوازیں آتی ہیں
مقید بادشاہوں کے سسکنے کی صدائیں گونجا کرتی ہیں
کبھی دارا، کبھی شاہ جہاں کی سسکیاں کانوں میں پڑتی ہیں

فتح پور سیکری

برآمدوں کے بعد پھر برآمدے
برآمدے، کچہریوں کے گرد گھومتے ہوئے برآمدے
طواف کرتے کالے کالے چُغوں میں
جزا و جرم کے یہ سارے پادری
لئے ہوئے ہیں فائلوں میں نقشے جیل خانوں کے
چُھپے ہوئے ہیں کوڑے اور پھندے پھانسیوں کے
آستینوں میں!

اتر رہے ہیں چڑھ رہے ہیں
سرکسوں کے تمبوؤں میں جس طرح سے جھولتے ہیں باز یگر
سر پڑے ہیں کرسیوں پہ مرتبانوں کی طرح
نیند سے بھرے ہوئے
گھڑونچیوں پہ لوگ بیٹھے بیٹھے اُونگھتے ہوئے
کتابیں طاق پر لگی جگالی کر رہی ہیں دانتوں میں
پھنسی دلیلوں کی

یہ گھیرا ڈالے کھوہ کھوہ کھیلتے برآمدے
برآمدے، کچہریوں کے گرد گھومتے ہوئے برآمدے!

کچہریاں

قبرستان ہے، قبرستان سے گذرو تو آہستہ بولو!

قبرستان میں اتنا اونچا بولنے کا دستور نہیں ہے
قبرستان سے گذرو تو پیروں کی آہٹ مدھم کرلو
چلتی پھرتی آوازوں سے مُردوں کو زحمت ہوتی ہے
ساکت مُردے، ساکت رہنا چاہتے ہیں
کروٹ لینا، مُردوں کے اطوار نہیں ہیں
قبرستان ہے

قبرستان میں ٹھہرو تو قبروں کے کتبوں پر نہ اپنی کہنی رکھ کے ٹیک لگانا
نام لکھے ہیں، اور تاریخیں
بوجھ پڑے تو گر پڑتے ہیں
قبرستان ہے، قبرستان سے آہستہ آہستہ گذرو
کوئی قبر ہلے نہ جاگے
لوگ اپنے اپنے جسموں کی قبروں میں بس مٹی اوڑھے دفن پڑے ہیں

قبرستان

اُدھیڑ کے، زمین پر
لٹا دیئے گئے حویلی کے تمام بال و پر!

چھتوں سے کلغیاں چمکتی شمعوں کی اتار کے
میانیں، تیغیں، ڈھالیں سب
دروں کے کھڑکیوں کے قبضے کھول کر
نمونے آنجہانی دستکاروں کے
چلا گیا ٹرک میں بھر کے دور ایک وقت کا!

کباڑی لے گئے لپیٹ کر مکان تو مگر
مکاں کے پیچھے پائیں باغ میں لگا
غروبِ آفتاب کا سنہری پیڑ چھوڑ کر چلے گئے!

حویلی

لباس

میرے کپڑوں میں ٹنگا ہے
تیرا خوشرنگ لباس!
گھر پہ دھوتا ہوں میں ہر بار اسے اور سُکھا کے پھر سے
اپنے ہاتھوں سے اسے استری کرتا ہوں مگر
استری کرنے سے جاتی نہیں شکنیں اس کی
اور دھونے سے گلے شکووں کے چکتے نہیں مٹتے!
زندگی کس قدر آساں ہوتی
رشتے گر ہوتے لباس
اور بدل لیتے قمیضوں کی طرح

درد کچھ دیر ہی رہتا ہے، بہت دیر نہیں
جس طرح شاخ سے توڑے ہوئے اک پتّے کا رنگ
ماند پڑ جاتا ہے کچھ روز الگ شاخ سے رہ کر
شاخ سے ٹوٹ کے یہ درد جئے گا کب تک؟

ختم ہو جائے گی جب اس کی رسد
ٹمٹمائے گا ذرا دیر کو بجھتے بجھتے
اور پھر لمبی سی اک سانس دھوئیں کی لے کر
ختم ہو جائے گا، یہ درد بھی بُجھ جائے گا۔
درد کچھ دیر ہی رہتا ہے، بہت دیر نہیں!!

شہد کا چھتّا

رات بھر ایسے لڑی جیسے کہ دشمن ہو مری!
آگ کی لپٹوں سے جھلسایا کبھی تیروں سے چھیدا
جسم پر دکھتی ہیں ناخونوں کی مرچیلی کھرونچیں
اور سینے پہ مرے، داغی ہوئی دانتوں کی مُہریں
رات بھر ایسے لڑی جیسے کہ دشمن ہو مری!

بھنبھناہٹ بھی نہیں صبح سے گھر میں اس کی
میرے بچوں میں گھری بیٹھی ہے
اپنی ممتا سے بھرا شہد کا چھتّا لے کر!!

یہ نظم سنسکرت کے ایک دوہے سے متاثر ہو کر لکھی گئی

ریپ

ایسا کچھ بھی تو نہیں تھا، جو ہُوا کرتا ہے فلموں میں ہمیشہ
نہ تو بارش تھی، نہ طوفانی ہوا، اور نہ جنگل کا سماں
نہ کوئی چاند فلک پر کہ جنوں خیز کرے
نہ کسی چشمے، نہ دریا کی اُبلتی ہوئی فانوسی صدائیں
کوئی موسیقی نہیں تھی پس منظر میں کہ جذبات میں ہیجان مچا دے
نہ وہ بھیگی ہوئی بارش میں، کوئی حور نما لڑکی تھی!

صرف عورت تھی وہ، کمزور تھی وہ
چار مردوں نے کہ وہ مرد تھے بس
پسِ دیوار اسے "ریپ" کیا!!

ریڈ

سرد موسم میں یہ، برفیلی بلاخیز ہوائیں
گھر کی دیواروں میں سوراخ بہت ہیں
اور ہوا گھستی ہے سوراخوں سے یوں سیٹی بجاتی
جس طرح "ریڈ" میں آتے ہیں حولدار تلاشی لینے
تیز سنگینیں چبھوتے ہوئے، دھمکاتے ہوئے!

صبہائے غزل

○

پھولوں کی طرح لب کھول کبھی
خوشبو کی زباں میں بول کبھی

الفاظ پرکھتا رہتا ہے
آواز ہماری تول کبھی

انمول نہیں لیکن پھر بھی
پوچھو تو مفت کا مول کبھی

کھڑکی میں کٹی ہیں سب راتیں
کچھ چورس تھیں، کچھ گول کبھی

کروٹ لیتے لیتے یہ فلک
ہو جاتا ہے ڈانوا ڈول کبھی

حواس کا جہان ساتھ لے گیا
وہ سارے بادبان ساتھ لے گیا

بتائیں کیا، وہ آفتاب تھا کوئی
گیا تو آسمان ساتھ لے گیا

کتاب بند کی اور اٹھ کے چل دیا
تمام داستان ساتھ لے گیا

وہ بے پناہ پیار کرتا تھا مجھے
گیا تو میری جان ساتھ لے گیا

میں سجدے سے اٹھا تو کوئی بھی نہ تھا
وہ پاؤں کے نشان ساتھ لے گیا

سرے ادھڑ گئے ہیں صبح و شام کے
وہ میرے دو جہان ساتھ لے گیا

○

گُلوں کو سننا ذرا تم، صدائیں بھیجی ہیں
گُلوں کے ہاتھ بہت سی، دعائیں بھیجی ہیں

جو آفتاب کبھی بھی غروب ہوتا نہیں
وہ دل ہے میرا، اسی کی شعاعیں بھیجی ہیں

تمہاری خشک سی آنکھیں، بھلی نہیں لگتیں
وہ ساری یادیں جو تم کو رلائیں بھیجی ہیں

سیاہ رنگ، چمکتی ہوئی کناری ہے
پہن لو اچھی لگیں گی، گھٹائیں بھیجی ہیں

تمھارے خواب سے ہر شب لپٹ کے سوتے ہیں
سزائیں بھیج دو، ہم نے خطائیں بھیجی ہیں

اکیلا پتّہ ہوا میں بہت بلند اُڑا
زمیں سے پاؤں اُٹھاؤ، ہوائیں بھیجی ہیں

○

آنکھوں میں جل رہا ہے پہ بجھتا نہیں دھواں
اُٹھتا تو ہے گھٹا سا، برستا نہیں دھواں

پلکوں کے ڈھانپنے سے بھی، رکتا نہیں دھواں
کتنی انڈیلیں آنکھیں پہ بجھتا نہیں دھواں

آنکھوں سے آنسوؤں کے مراسم پرانے ہیں
مہماں یہ گھر میں آئیں تو چبھتا نہیں دھواں

چولھے نہیں جلائے کہ بستی ہی جل گئی
کچھ روز ہو گئے ہیں اب اٹھتا نہیں دھواں

کالی لکیریں کھینچ رہا ہے فضاؤں میں
بَورا گیا ہے کچھ بھی تو کھلتا نہیں دھواں

آنکھوں کے پونچھنے سے لگا آگ کا پتہ
یوں چہرہ پھیر لینے سے چھپتا نہیں دھواں

چنگاری اک اٹک سی گئی میرے سینے میں
تھوڑا سا آ کے پھونک دو، اُڑتا نہیں دھواں

کانچ کے پیچھے چاند بھی تھا اور کانچ کے اوپر کائی بھی
تینوں تھے ہم، وہ بھی تھے، اور میں بھی تھا، تنہائی بھی

یادوں کی بوچھاڑوں سے جب پلکیں بھیگنے لگتی ہیں
سوندھی سوندھی لگتی ہے تب، ماضی کی رسوائی بھی

دو دو شکلیں دِکھتی ہیں اس بہکے سے آئینے میں
میرے ساتھ چلا آیا ہے، آپ کا اک سودائی بھی

کتنی جلدی میلی کرتا ہے پوشاکیں، روز فلک
صبح کو رات اتاری تھی اور شام کو شب پہنائی بھی

خاموشی کا حاصل بھی اک لمبی سی خاموشی تھی
ان کی بات سنی بھی ہم نے، اپنی بات سنائی بھی

کل ساحل پر لیٹے لیٹے، کتنی ساری باتیں کیں
آپ کا ہنکارا نہیں آیا، چاند نے بات کرائی بھی

○

کچھ روز سے وہ سنجیدہ ہے
ہم سے کچھ کچھ رنجیدہ ہے

چل دل کی راہ سے ہو کے چلیں
دلچسپ ہے اور پیچیدہ ہے

ہم عمر خدا ہوتا کوئی
جو ہے، وہ عمر رسیدہ ہے

بیدار نہیں ہے کوئی بھی
جو جاگتا ہے، خوابیدہ ہے

ہم کس سے اپنی بات کریں
ہر شخص ترا گرویدہ ہے

○

کہیں تو گرد اُڑے، یا کہیں غبار دِکھے
کہیں سے آتا ہوا کوئی شہسوار دِکھے

رواں ہیں پھر بھی رکے ہیں وہیں پہ صدیوں سے
بڑے اداس لگے جب بھی آبشار دِکھے

کبھی تو چونک کے دیکھے کوئی ہماری طرف
کسی کی آنکھ میں ہم کو بھی انتظار دِکھے

خفا تھی شاخ سے شاید، کہ جب ہوا گزری
زمیں پہ گرتے ہوئے پھول بے شمار دِکھے

کوئی طلسمی صفت تھی، جو اس ہجوم میں وہ
ہوئے جو آنکھ سے اوجھل تو بار بار دِکھے

○

کیوں غریبوں سے کھیلتی ہے رات
روز اک چاند بیلتی ہے رات

ہر طرف دُھول دَھول اُڑتی ہے
آسماں جب لپیٹتی ہے رات

شمعیں ساری بجھا کے جاتی ہے
گھر کا معمول جانتی ہے رات

رنگ اڑنے لگا ہے چہرے سے
کتنی کمزور ہو گئی ہے رات

تیری آواز گھولتی ہے کچھ
ایسی مدّھم سی بولتی ہے رات

کس میں رکھّی ہے صبح کی دھڑکن
غنچہ غنچہ ٹٹولتی ہے رات

دفن ہے چاند کس جگہ اس کا
بند قبریں پھرولتی ہے رات

○

تنکا تنکا کانٹے توڑے، ساری رات کٹائی کی
کیوں اتنی لمبی ہوتی ہے، چاندنی رات جدائی کی

نیند میں کوئی اپنے آپ سے باتیں کرتا رہتا ہے
کال کنوئیں میں گونجتی ہے، آواز کسی سودائی کی

سینے میں دل کی آہٹ، جیسے کوئی جاسوس چلے
ہر سائے کا پیچھا کرنا، عادت ہے ہرجائی کی

آنکھوں اور کانوں میں کچھ سناٹے سے بھر جاتے ہیں
کیا تم نے اُڑتی دیکھی ہے، ریت کبھی تنہائی کی

تاروں کی روشن فصلیں اور چاند کی ایک درانتی تھی
ساہو نے گروی رکھ لی تھی میری رات کٹائی کی

○

گرم لاشیں گریں فصیلوں سے
آسماں بھر گیا ہے چیلوں سے

سولی چڑھنے لگی ہے خاموشی
لوگ آئے ہیں سن کے میلوں سے

کان میں ایسے اتری سرگوشی
برف پھسلی ہو جیسے ٹیلوں سے

گونج کر ایسے لوٹتی ہے صدا
کوئی پوچھے ہزاروں میلوں سے

پیاس بھرتی رہی مرے اندر
آنکھ ہٹتی نہیں تھی جھیلوں سے

لوگ کندھے بدل بدل کے چلے
گھاٹ پہنچے بڑے وسیلوں سے

ایک پرواز دکھائی دی ہے
تیری آواز سنائی دی ہے

صرف اک صفحہ پلٹ کر اس نے
ساری باتوں کی صفائی دی ہے

پھر وہیں لوٹ کے جانا ہو گا
یار نے کیسی رہائی دی ہے

جس کی آنکھوں میں کٹی تھیں صدیاں
اس نے صدیوں کی جدائی دی ہے

زندگی پر بھی کوئی زور نہیں
دل نے ہر چیز پرائی دی ہے

آگ میں رات جلا ہے کیا کیا
کتنی خوش رنگ دکھائی دی ہے

ترویٰنی ـــــ گنگا، جمنا، سرسوتی

کچھ خوابوں کے خط ان میں، کچھ چاند کے آئینے، سورج کی شعاعیں ہیں
شعروں کے لفافے ہیں، کچھ تجربے ہیں میرے کچھ میری دعائیں ہیں

بوسکی کے لئے

نکلو گے سفر پہ جب، یہ ساتھ میں لے لینا، شاید کہیں کام آئیں

○

ہاتھ ملا کر دیکھا اور کچھ سوچ کے میرا نام لیا
جیسے یہ سرورق کسی ناول پر پہلے دیکھا ہے

رشتے کچھ بس بند کتابوں ہی میں اچھے لگتے ہیں

○

سامنے آئے مِرے، دیکھا مجھے، بات بھی کی
مسکرائے بھی، پرانی کسی پہچان کی خاطر!

کل کا اخبار تھا، بس دیکھ لیا، رکھ بھی دیا!!

○

○

شعلہ سا گزرتا ہے مرے جسم سے ہو کر
کس لَو سے اُتارا ہے خداوند نے تم کو!

تنکوں کا مرا گھر ہے، کبھی آؤ تو کیا ہو؟

○

کوئی چادر کی طرح کھینچے چلا جاتا ہے دریا
کون سویا ہے تلے اس کے، جسے ڈھونڈ رہے ہیں

ڈُوبنے والے کو بھی چین سے سونے نہیں دیتے

○

○

ستارے، چاند کی کشتی میں رات لاتی ہے
سحر کے آنے سے پہلے ہی بک بھی جاتے ہیں

بہت ہی لچھا ہے بیوپار ان دِنوں شب کا!

○

بس ایک پانی کی آواز، لپلپاتی ہے
کہ گھاٹ چھوڑ کے مانجھی تمام جا بھی چکے

چلو نا! چاند کی کشتی میں جھیل پار کریں

○

○

زمین اُس کی ، زمیں کی یہ نعمتیں اُس کی
یہ سب اُسی کا ہے، گھر بھی، یہ گھر کے بندے بھی

خدا سے کہئے کبھی وہ بھی اپنے گھر آئے

○

اک نوالے سی نگل جاتی ہے یہ نیند مجھے
ریشمی موزے نگل جاتے ہیں پاؤں جیسے

صبح لگتا ہے کہ تابوت سے نکلا ہوں ابھی

○

○

کاش آئے کوئی ، شاعر کی سنے
شعر کے درد سے مر جائے گا!

چاندنی پھانک رہا تھا شب بھر!!

○

کچھ انتظار میں، کچھ ہجر، کچھ وصال میں تھے
بہت سے لوگ تھے کل رات چاند کشتی میں

مگر سحر کی کسی کو بھی آرزو ہی نہ تھی!

○

○

عمر کے کھیل میں اک طرفہ ہے یہ رسّہ کشی
اک سِرا مجھ کو دیا ہوتا، تو اک بات بھی تھی

مجھ سے تگڑا بھی ہے، اور سامنے آتا بھی نہیں

○

خفا رہے وہ ہمیشہ تو کچھ نہیں ہوتا
کبھی کبھی جو ملے ، آنکھیں پھوٹ پڑتی ہیں

بتائیں کس کو ، بہاروں میں درد ہوتا ہے

○

○

لوگ میلوں میں بھی گم ہو کر ملے ہیں بارہا
داستانوں کے کسی دلچسپ سے اک موڑ پر

یوں ہمیشہ کے لیے بھی کیا بچھڑتا ہے کوئی؟

○

آپ کی خاطر اگر ہم لُوٹ بھی لیں آسماں
کیا ملے گا چند چمکیلے سے شیشے توڑ کے!

چاند چُبھ جائے گا اُنگلی میں تو خون آ جائے گا

○

○

پَو پھوٹی ہے اور کرنوں سے کانچ بجے ہیں
گھر جانے کا وقت ہوا ہے پانچ بجے ہیں

ساری شب گھڑیال نے چوکیداری کی ہے!!

○

اس سے پہلے ، رات مرے گھر چھاپا مارے
میں تنہائی تالے میں بند کر آتا ہوں

''گربا'' ناچتا ہوں پھر گھومتی سڑکوں پر!!

○

○

رات ، پریشاں سڑکوں پر اک ڈولتا سایہ
کھمبے سے ٹکرا کے گرا اور فوت ہوا!

تاریکی کی ناجائز اولاد تھی کوئی!!

○

بے لگام اُڑتی ہیں کچھ خواہشیں ایسے دل میں
"میکسیکن" فلموں میں کچھ دوڑتے گھوڑے جیسے

تھان پر باندھی نہیں جاتیں، سبھی خواہشیں مجھ سے!!

○

○

کبھی کبھی بازار میں یوں بھی ہو جاتا ہے
قیمت ٹھیک تھی، جیب میں اتنے دام نہیں تھے

ایسے ہی اک بار مَیں ، تم کو ہار آیا تھا!!

○

نہ ہم مڑے ، نہ کہیں راستہ مڑا اپنا
نشیب آئے کہیں، اور کہیں فراز آئے

میں نیچے نیچے چلا، تم بلندیوں پہ رہیں!

○

○

وہ میرے ساتھ ہی تھا دور تک، مگر اک دن
جو مڑ کے دیکھا تو وہ دوست میرے ساتھ نہ تھا

پھٹی ہو جیب تو کچھ سکّے کھو بھی جاتے ہیں

○

کچھ مرے یار تھے رہتے تھے مرے ساتھ ہمیشہ
کوئی آیا تھا، انھیں لے کے گیا، پھر نہیں لوٹے

شیلف سے نکلی کتابوں کی جگہ خالی پڑی ہے

○

○

اِتنی نمبی انگڑائی لی لڑکی نے
شعلے جیسے سورج پر جا ہاتھ لگا

چھالے جیسا چاند پڑا ہے اُنگلی پر

○

بُڑبُڑ کرتے لفظوں کو چمٹی سے پکڑو
پھینکو اور مسل دو ' پَیر کی ایڑی سے

افواہوں کو خوں پینے کی عادت ہے

○

○

پرچیاں بٹ رہی ہیں گلیوں میں
اپنے قاتل کا انتخاب کرو

وقت یہ سخت ہے چناؤ کا

○

چُوڑی کے ٹکڑے تھے، پَیر میں چبھتے ہی خوں بہہ نکلا
ننگے پاؤں کھیل رہا تھا، لڑکا گھر کے آنگن میں

باپ نے کل پھر دارُو پی کے، ماں کی بانہہ مروڑی تھی

○

○

زمین گھومتی ہے گرد آفتاب کے
زمیں کے گرد گھومتا ہے چاند رات دن

ہیں تین ہم ! ہماری فیملی ہے تین کی

○

کچھ آفتاب اور اُڑے کائنات میں
میں آسمان کی جٹائیں کھول رہا تھا!

وہ تولیے سے گیلے بال چھانٹ رہی تھی!

○

○

جنگل سے گزرتے تھے تو کبھی بستی بھی مل جاتی تھی
اب بستی میں کوئی پیڑ نظر آ جائے تو جی بھر آتا ہے

دیوار پہ سبزہ دیکھ کے اب، یاد آتا ہے پہلے جنگل تھا!

○

جاتے جاتے ایک بار تو کار کی بتی سرخ ہوئی
شاید تم نے سوچا ہو کہ رک جاؤ، یا لوٹ آؤ

سگنل توڑ کے لیکن تم اک دوسری جانب گھوم گئے!

○

○

پیڑوں کے کٹنے سے ناراض ہوئے ہیں شاید
دانہ چگنے بھی نہیں آتے مکانوں پہ پرندے

کوئی بلبل بھی نہیں بیٹھتی اب شعر پہ آ کر

○

ذرا ''پیلیٹ'' سنبھالو رنگ و بُو کا
میں کینوس آسماں کا کھولتا ہوں

بناؤ پھر سے صورت آدمی کی

○

○

عجیب کپڑا دیا ہے مجھے سِلانے کو
کہ طول کھینچوں اگر، ارض چُھوٹ جاتا ہے

اُدھڑنے سینے ہی میں عمر کٹ گئی ساری

○

مَیں سب سامان لے کر آ گیا اِس پار سرحد کے
مِری گردن کسی نے قتل کر کے اُس طرف رکھ لی

اسے مجھ سے بچھڑ جانا، گوارا نہ ہوا شاید

○

○

ہوائیں زخمی ہو جاتی ہیں کانٹے دار تاروں سے
جبیں گھستا ہے دریا جب تری سرحد گزرتا ہے

مرا اک یار ہے، دریائے راوی پار رہتا ہے

○

میں رہتا اِس طرف ہوں یار کی دیوار کے لیکن
مرا سایہ جو ہے، دیوار کے اُس پار گرتا ہے

بڑی کچی سی سرحد ایک اپنے جسم و جاں کی ہے

○

○

جس سے بھی پوچھا ٹھکانا اس کا
اک پتہ اَور بتا جاتا ہے

یا وہ بے گھر ہے، یا ہرجائی ہے

○

کیا بتلائیں ؟ کیسے یاد کی موت ہوئی
ڈوب کے پانی میں پرچھائیں فوت ہوئی

ٹھہرے پانی کتنے گہرے ہوتے ہیں

○

○

کون کھائے گا؟ کِس کا حصّہ ہے؟
دانے دانے پہ نام لکھّا ہے

سُودچند، مُولچند، اور جیٹھا!

○

اِتنے لوگوں میں کہہ دو آنکھوں سے
اتنا اونچا نہ ایسے بولا کریں

سب مرا نام جان جاتے ہیں!

○

○

ماں نے جس چاندسی دُلہن کی دُعائیں دی تھیں
آج کی رات وہ فٹ پاتھ سے دیکھا میں نے!

رات بھر روٹی نظر آیا ہے وہ چاند مجھے!

○

سارا دن بیٹھا، مَیں ہاتھ میں لے کر خالی کاسہ
رات جو گذری، چاند کی کوڑی ڈال گئی اس میں

سود خور سورج کل مجھ سے یہ بھی لے جائے گا

○

○

آؤ سارے پہن لیں آئینے
سارے دیکھیں گے اپنا ہی چہرہ

سب کو سارے حسیں لگیں گے یہاں

○

کہیں مٹی اُچھلتی ہے، کہیں کنکر چھٹکتا ہے
کہ ٹھڈے مارتی چلتی ہیں راہوں میں ہوائیں

عجب لڑکوں سے لگتی ہیں یہ دوشیزہ ادائیں!

○

○

تمام صفحے کتابوں کے پھڑپھڑانے لگے
ہَوا دھکیل کے دروازہ آ گئی گھر میں

کبھی ہَوا کی طرح تم بھی آیا جایا کرو!

○

وہ جس سے سانس کا رِشتہ بندھا ہُوا تھا مِرا
دبا کے دانت تلے، سانس کاٹ دی اس نے

کٹی پتنگ کا مانجا، محلّے بھر میں لٹا!

○

○

زہریلے مچھر مارو آوازوں کے
سُوجن ہو جاتی ہے ان کے کاٹے سے

مچھر دانی تان کے جینا مشکل ہے!

○

اِس تیز دھوپ میں بھی اکیلا نہیں تھا میں
اک سایہ میرے دونوں طرف دوڑتا رہا

تنہا ترے خیال نے رہنے نہیں دیا!

○

○

کوئی صورت بھی مجھے پوری نظر آتی نہیں
آنکھ کے شیشے مرے چٹخے ہوئے ہیں کب سے

ٹکڑوں ٹکڑوں میں سبھی لوگ ملے ہیں مجھ کو

○

تیری صورت جو بھری رہتی ہے آنکھوں میں سدا
اجنبی لوگ بھی پہچانے سے لگتے ہیں مجھے

تیرے رِشتے میں تو دنیا ہی پرو لی میں نے!

○

○

ایک سے گھر ہیں سبھی، ایک سے باشندے ہیں
اجنبی شہر میں، کچھ اجنبی لگتا ہی نہیں

ایک سے درد ہیں سب، ایک سے ہی رشتے ہیں

○

چاند کے ماتھے پر بچپن کی چوٹ کے داغ نظر آتے ہیں
روڑے، پتھر، اور غلّوں سے دن بھر کھیلا کرتا تھا

بہت کہا آوارہ اُلکاؤں کی سنگت ٹھیک نہیں

○

○

چُھو کے فانوس گذرتی ہے صبا جب گھر سے
تیری آواز کے چھینٹے سے چھڑک جاتی ہے

گدگدانے سے تُو ایسے ہی ہنسا کرتی ہے

○

ایک اک یاد اٹھاؤ اور پلکوں سے پونچھ کے واپس رکھ دو
اشک نہیں یہ آنکھ میں رکھے، قیمتی قیمتی شیشے ہیں!

طاق سے گر کے قیمتی چیزیں ٹوٹ بھی جایا کرتی ہیں

○

○

زندگی کیا ہے، جاننے کے لئے
زندہ رہنا بہت ضروری ہے

آج تک کوئی بھی رہا تو نہیں !

○

ایسے بکھرے ہیں رات دن، جیسے
موتیوں والا ہار ٹوٹ گیا

تم نے مجھ کو پرو کے رکھا تھا

○

○

دریا جب اپنے پانی کھنگالتے ہیں طغیانی میں
جتنا کچھ ملتا ہے وہ سب ساحل پر رکھ جاتے ہیں

لے جاتے ہیں، کرم جو لوگوں نے پھینکے ہوں دریا میں

○

ہے نہیں جو دِکھائی دیتا ہے
آبئنے پر چھپا ہوا چہرہ

ترجمہ آئینے کا ٹھیک نہیں

○

○

ایسے آئی ہے تری یاد اچانک
جیسے پگڈنڈی کوئی پیڑوں سے نکلے

اک گھنے ماضی کے جنگل میں ملی ہو

○

یہ سُست دھوپ ابھی نیچے بھی نہیں اُتری
یہ سَردیوں میں بہت دیر چھت پہ سوتی ہے

لحاف اُمید کا بھی کب سے تار تار ہُوا!

○

○

اِتنے عرصے بعد ہینگر سے کوٹ نکالا
کتنا لمبا بال مِلا ہے کالر پر

پچھلے جاڑوں میں پہنا تھا، یاد آتا ہے

○

کھڑکیاں بند ہیں، دروازوں پہ بھی تالے ہیں
کیسے یہ خواب چلے آتے ہیں پھر کمرے میں

نیند میں کوئی تو رَوزن ہے، کُھلا رہتا ہے!

○

○

تیرے شہر پہنچ تو جاتا
رستے میں دریا پڑتے ہیں

پُل سب تو نے جلا دیئے تھے

○

تمھارے ہونٹ بہت خشک خشک رہتے ہیں
انھی لبوں پہ کبھی تازہ شعر ملتے تھے

یہ تم نے ہونٹوں پہ افسانے رکھ لیے کب سے'

○

○

کونے والی سیٹ پہ اب دو اور ہی کوئی بیٹھتے ہیں
پچھلے چند مہینوں سے، اب وہ بھی لڑتے رہتے ہیں

کلرک ہیں دونوں، لگتا ہے اب شادی کرنے والے ہیں

○

میں بس میں بیٹھا ہوا ڈھونڈنے لگا مڑ کے
نہ جانے کیوں یہ لگا، تم وہیں کہیں پر ہو

تمہارا سینٹ، کسی اَور نے لگایا تھا

○

○

کچھ اس طرح خیال ترا جل اٹھا کہ بس
جیسے دیا سلائی جلی ہو اندھیرے میں

اب پھونک بھی دو ورنہ یہ انگلی جلائے گا

○

بس دن ڈھلا کہ آلے میں اک چہرہ جل اٹھا
اک تازہ زخم کی سی وہاں روشنی ہوئی

اور جلتی شمعوں سے کئی قطرے پگھل گئے

○

○

کانٹے والی تار پہ کس نے گیلے کپڑے ٹانگے ہیں
خون ٹپکتا رہتا ہے اور نالی میں بہہ جاتا ہے

کیوں اس فوجی کی بیوہ ہر روز یہ وردی دھوتی ہے

○

ہل واہا تھا ہوری نے اور زمیندار کے کھیت ہوئے
غلّہ بیچا بنیے نے، اور داتا کی تعریف ہوئی

مٹی کی گودی پھر خالی، جس نے کھیت اگائے تھے

○

○

آؤ زبانیں بانٹ لیں، اب اپنی اپنی ہم
تم کب سنو گے بات، نہ ہم کو سمجھنا ہے

دو اَن پڑھوں کو کتنی محبت ادب سے ہے

○

ساری وادی اداس بیٹھی ہے
موسمِ گل نے خود کشی کر لی

''مائنز'' پر پاؤں رکھ دیا اُس نے

○

○

ناپ کے، وقت بھرا جاتا ہے ہر ''ریت گھڑی'' میں
اک طرف خالی ہو جب، پھر سے اُلٹ دیتے ہیں اُس کو

عمر جب ختم ہو، کیا مجھ کو وہ الٹا نہیں سکتا ؟

○

چڑیاں اڑتی ہیں مرے کانچ کے دروازے کے باہر
ناچتی دھوپ کی چنگاریوں میں جان بھری ہے!

اور مَیں چِتا کا تودہ ہوں، جو کمرے میں پڑا ہے

○

○

پتھر کی دیوار پہ، لکڑی کے اک فریم میں، کانچ کے اندر پھول بنے ہیں
ایک تصور خوشبو کا، اور کتنے سارے پہناووں میں بند کیا ہے

عشق پہ دل کا ایک لباس ہی کافی تھا، اب کتنی پوشاکیں پہنے گا؟

○

یہ آدھا چاند کالے آسماں اُوپر
اندھیرا چاٹتی ہے جیسے حبشن

کڑھائی صبح تک چٹ کر کے جاتی ہے

○

○

ایک تمبو لگا ہے سرکس کا
بازی گر جھولتے ہی رہتے ہیں

ذہن خالی کبھی نہیں ہوتا!

○

چلوناں، شور میں بیٹھیں جہاں کچھ نہ سنائی دے
کہ اس خاموشی میں تو سوچ بھی بجتی ہے کانوں میں

بہت بتیایا کرتی ہے یہ پھاپے کٹنی تنہائی!

○

یہ گھر ایک سلطنت تھا
جس کے تم فرمانروا تھے
سزاؤں سے سزاؤں تک
تمہاری سلطنت میں ایک ہی قانون چلتا تھا
محبت کا۔۔!
تم اس مسند پہ فائز تھے
تم اس مسند پہ فائز ہو

میری بھی ایک گپھا تھی
جو ہست و بود کی سرحد سے آگے تھی
میں اس میں جا کے خود کو ڈھونڈتی تھی
جمع اور تفریق کرتی تھی
کبھی تفریق بڑھ جاتی اندھیرا گھیرنے لگتا
تو تم چپکے سے آتے اور اک دیوٹ جلا جاتے!
تمہاری آنکھ کا پانی دئے کو روشنی دیتا
اسی کی روشنی میں میں نے
اپنی اور تمہاری روح کی شکنوں کو دیکھا تھا

کہاں پہلے ملے ہیں ہم؟
کہیں پچھلے جنم میں ہی ملے ہونگے
وگرنا اس جنم میں تو تمہیں میں نے نہیں دیکھا
تو پھر پہچان کی پگڈنڈیوں پر
کس کے قدموں کے نشان ہیں؟
ہمیشہ کی طرح کچھ روشنی دو۔۔۔!
منصورہ احمد

کور ڈیزائن : پرشانت مکھر جی
شاعر کی تصویر : میگھنا گلزار

236

ISBN 81-291-0070-3

9 788129 100702

Rs. 295